رسالہ بابت

تعلیم و تشریح احکام

مصنفہ

پادری ہوپر صاحب - ڈی - ڈی

کرسچین نالج سوسائٹی کیلئے

مشن پریس لودیانہ - ایم - وائلی منیجر

سنہ ۱۸۹۹ء

حصہ اول

[illegible]یم یعنی سوال و جواب کی تفسیر

سبق (۱) بپتسمہ کے باب میں

[illegible] سوال یہہ ہی کہ تمہارا نام کیا ہی؟

[illegible] جواب میں صرف اپنا مسیحی نام بتانا چاہیے یعنی تمہارا وہ نام جو بپتسمہ
[illegible] تمہارے باپ یا خاندان کے نام سے یہاں کچھ مطلب نہیں۔ اس مقام
[illegible] سمجھا جاتا ہی؟ اس سبب سے کہ یہہ وہ نام ہی جو تمہارے مسیحی
[illegible] لوگ کہتے ہیں کہ نام کوئی چیز نہیں لیکن یہہ ہرگز درست نہیں اگرچہ
[illegible] وہ چیز جس کا نشان ہی بہت قدر کے لایق ہی تو اُس کا نشان
[illegible] ہو سکتا۔ تمہارا نام کچھ ہی ہو لیکن چونکہ وہ تمہارے مسیحی ہونیکا نشان ہی اسلئے
[illegible] قدر کے لایق ہی۔ یہہ بات کچھ لحاظ کے قابل نہیں کہ پسندیدہ نام ہی یا ناپسندیدہ
[illegible] آواز یا لفظی معنے سے کچھ مطلب نہیں بلکہ تمام مطلب اِس سے ہی کہ
[illegible] جب کبھی تم اپنا یہہ نام سنو یا لکھو تو تم کو یہہ خیال کرنا چاہیے کہ
[illegible] کہ تم اس امر پر فخر کرو اور خدا کا شکر بجالاؤ اور اس اعلیٰ لقب کے موافق

چلنے کی کوشش کرو ۔

پھر یہہ امر بھی غور کے لائق ہے کہ خدا نے چند آدمیوں کے نام جو کتاب مقدس
میں خود رکھے ہیں مثلاً حضرت ابراہیم اور اسرائیل اور سلیمان اور یہیہ شاہ ولا
بپتسما بلکہ خود خداوند یسوع اور اُس کے رسول پطرس کا۔ اِس سے یہہ ثابت ہے
تعالیٰ کا آدمیوں کے نام سے بے فکر ہونا نا ممکن ہے۔ پھر حضرات مذکورہ میں ابر
اور پطرس کا نام خدا نے نیا ہی رکھا اور یہہ اِس بات کا نشان تھا کہ وہ کسی نئی
نئی چال چلنے لگیں گے یا اُن کا کسی طرح سے نیا حال شروع ہو جائیگا اور یہ
ہی حال ہے۔ کیونکہ خواہ کوئی بچہ جس کا آگے نام نہ تھا بپتسمہ میں نام پائے
جس کا پیشتر نام تھا اس میں نیا نام پائے دونوں حالتوں میں اس کا نام نشانہ
ہے۔ اِس لئے کہ مسیحی زندگی واقع میں نئی زندگی ہے۔ دیکھو پیدائش ۱۷: ۵ و ۶
۳۲: ۲۸ و یسعیاہ ۶۲: ۲ ۔ لوقا ۱: ۱۳ و ۳۱ ۔ یوحنا ۱: ۴۲ ۔ رومیوں ۶: ۴ و ۵

۲۔ کاٹکزم کے دوسرے سوال کے جواب کا پہلا حصہ یہہ بتاتا ہے کہ
کیونکہ ہمارا نام ماں باپ کی طرف سے رکھا گیا تھا اور چونکہ بپتسمے کے وقت
نام ہونیکا دستور خدا کے کلام میں مقرر نہیں اس لئے ہم اُسے ضروری تو نہ
چند سببوں سے مفید بہت ہے ایک تو یہہ کہ بچّے خود نہ بپتسمے کے لئے آسکتے
نہ مسیحی چال چلن کے ارادیکا وہ اقرار کر سکتے ہیں جو بپتسمہ کے وقت نہایت
اس لئے ضرور ہے کہ کوئی اُن کو لائے اور اُن کی طرف سے اقرار کرے ۔

دوسرے بچہ کا بپتسمہ بغیر مسیحی تعلیم کے بے فائدہ ہے اور بالغ کا بپتسمہ بھی

لیے اِس لیے بھی نہایت غور ہی کہ اُن کے بپتسمہ کے وقت کوئی اور شخص اپنے اوپر یہہ
ہر جو تعلیم اُنھیں دینی چاہیے وہ میں دونگا یاد دلاؤنگا ۔

لیکن اِس دوسرے جواب کا دوسرا حصّہ بہت زیادہ غور کے لایق ہی اِس میں بپتسمہ کا
لب اور مقصد صاف طور سے بیان ہوا ہی۔ اور یہہ ذکر ہی کہ بپتسمہ کے وقت اور
کے ذریعہ سے میرا چال چلن پہلے کی نسبت تین طرح سے بدل گیا یعنے میرا بپتسمہ محض
ظاہری نشان نہ تھا بلکہ باطنی تبدیلی کا وسیلہ بھی تھا۔ اُن تین تبدیلیوں میں سے پہلی تبدیلی
یہہ ہی میں مسیح کا عضو بنگیا عضو کس کو کہتے ہیں؟ بدن کے ایک حصّہ کو۔ لیکن بدن کے
ہر حصّہ کو عضو نہیں کہتے بلکہ ایسے ہی حصّہ کو کہتے ہیں جو ایک طرح کی فردیت رکھتا ہو۔ اگرچہ
بدن سے جدا ہو کر قایم نرہ سکتا ہو۔ چنانچہ آنکھ۔ کان۔ منہہ۔ چھاتی۔ پیٹ۔ ہاتھ۔ پانوں
ہر ایک عضو کہتے ہیں۔ اب مسیح کے عضو سے کیا مراد ہی؟ یاد ہی کہ جس بدن میں ہم بپتسمہ
کے وسیلے سے پیوند ہو کر اُس کے عضو بن گئے ہیں وہ مسیح کی ذات نہیں بلکہ اُس کی کلیسیا ہی
یعنے عہدنامہ میں چند جگہ کلیسیا کو مسیح کا بدن کہا گیا ہی دیکھو افسیوں ۱: ۲۲، ۲۳
اور ۴: ۱۵، ۱۶ اور ۱۔ قرنتیوں ۱۲: ۲۷۔ میں صاف لکھا ہی کہ مسیحی لوگ سب ملکر مسیح کا
بدن ہیں اور جدا جدا اُس کے اعضا ہیں لیکن مسیح اور اُس کی کلیسیا میں ایسا علاقہ اور یگانگی
ہی کہ اُسی باب کی بارھویں آیت میں کلیسیا مسیح کے نام سے نامزد ہی یعنے جس بدن کے ہم لوگ
عضو ہیں وہ مسیح کہا گیا ہی اور مسیح کے اور ہمارے درمیان جو علاقہ اُس باب کی
بارھویں سے ستائیس تک بدن اور اعضا کی تشبیہہ سے مفصّل بیان ہوا اور جس
تیرھویں آیت میں یہہ خاص ذکر آیا کہ وہ بپتسمہ کے وسیلے سے باندھا گیا تھا اُسی کو

خود مسیح نے یوحنا ۱۵: ۵ میں انگور کے درخت اور اُس کی ڈالیوں کی تشبیہ سے بیان کیا
ہے۔ یہہ کیسا اعلیٰ درجہ ہے جس پر ہم مقرر ہوئے ہیں کہ خدا کے ابن عزیز سے جو ابن آدم کا
ہوا ہم ایسے وابستہ و پیوستہ کئے گئے ہیں۔ جیسے درخت میں ڈالیاں اور بدن میں
اعضا ہوتے ہیں یہہ ہم لوگوں کی مرضی سے نہیں ہوا بلکہ محض خدا کے فضل سے
پس چاہئے کہ ہم ایسے درجہ کے موافق چلیں *

بپتسمہ کے وقت جو دوسری تبدیلی ہوئی وہ یہہ ہے کہ ہم خدا کا فرزند بنا ایک طرح
سے تو سب آدمی خدا کے فرزند ہیں جس طرح کھوئے ہوئے بیٹے کی تمثیل میں دونوں ایک
ہی باپ کے فرزند تھے گو کہ ان میں سے ایک اُس سے دور اور گمراہ ہو گیا تھا اور جب
تک باپ کی طرف نہ پھرا اُس وقت تک بیٹا ہونے کا مطلق فائدہ نہ اٹھایا۔ لیکن جو بیٹا
باپ کے گھر پر رہا اُس سے باپ نے کہا کہ اے بیٹے تو تو ہمیشہ میرے پاس ہی رہتا ہے اور جو کچھ
میرا ہے وہ تیرا ہی ہے۔ لوقا ۱۵: ۳۱ بپتسمہ کے وسیلے سے خدا تعالیٰ نے ہم کو اُس دنیا میں سے
جو اُس کو نہیں پہچانتی۔ یوحنا ۱۷: ۲۵ اُٹھا کر اپنے خاص خاندان میں داخل کیا تاکہ ہم
اُس کو پہچانیں اور اُس کے چہرہ کو بیخوف دیکھا کریں اور اُس پر فرزندانہ بھروسہ رکھیں اور
اُس کے احکام کو محبت سے بجا لائیں اور ہمیشہ خوش رہیں۔ اِس طرح سے وہ خاص طور پر
ہمارا آسمانی باپ ہوا اور ہماری نئی پیدائش ہوئی دیکھو یوحنا ۳: ۵ و گلتیوں ۳: ۲۶ و ۴: ۶

تیسری تبدیلی یہہ ہے کہ ہم آسمان کی سلطنت کے وارث بن گئے اِس کا سمجھنا ذرا مشکل
ہے زیادہ تفسیر کی ضرورت ہوگی اِس میں دو لفظ تشریح طلب ہیں ایک تو وارث یہہ لفظ اکثر
دو معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ یا تو نسب کی وجہہ سے کوئی شخص زمین یا کسی اور طرح کے مال کا

اُمیدوار ہو جسے ہنوز نہیں پایا۔ یا اُس مال کو حاصل کر چکا ہو یہاں دونوں معنے صادق آتے ہیں۔ ایک طرح سے تو ہم سبھی لوگ آسمان کی بادشاہت کے مالک ہو چکے ہیں خدا باپ نے ہم کو مسیح میں آسمانی مقاموں پر ہر طرح کی برکت بخشی (افسیوں ۱: ۳) اور ہم کو مسیح کے ساتھ جلایا اور آسمانی مقاموں پر اُس کے ساتھ بٹھایا (افسیوں ۲: ۶) اور مسیح نے ہم کو ایک بادشاہت بنایا تاکہ اُس کے خدا اور باپ کے لئے کاہن ہوں (مکاشفہ ۱: ۶) اور ہم زمین پر بادشاہت کرینگے (مکاشفہ ۵: ۱۰) اور دوسری طرح سے ہم زمین پر صرف اُمیدواری میں دیکھو رومیوں ۸: ۲۴ و ۲۵ کو نیز ۱ پطرس ۱: ۳ و ۴ میں لکھا ہے کہ خدا نے ہم کو نئی پیدائش کے ذریعہ سے ایک ایسی میراث کی اُمید بخشی ہے جو غیر فانی اور بیداغ اور بے زوال ہے پس اس سے ظاہر ہے کہ آسمان کی سلطنت ایسی شے ہے کہ کسی قدر تو ہم کو اس زندگی میں حاصل ہوتی ہے اور پورے طور سے اُس جہان میں حاصل ہونے والی ہے اب ہم پھر پوچھتے ہیں کہ وہ شے کیا ہے؟ تمہیں یاد ہوگا کہ جس طرح مقدس متی کے بعض مقاموں میں آسمان کی بادشاہت کا ذکر آیا ہے اسی طرح نئے عہدنامہ کی اور کتابوں میں اکثر خدا کی سلطنت کا ذکر ہے پس ظاہر ہے کہ ان دونوں اصطلاحوں سے ایک ہی مراد ہے خدا کی سلطنت آسمان کی سلطنت بھی کہلاتی ہے اس لئے کہ آسمان خدا کا تخت ہے یسعیاہ ۶۶: ۱ و متی ۵: ۳۴ اور زمین پر جہاں کہیں خدا کی سلطنت قائم ہے وہ آسمان کی مانند ہو گئی اور گویا آسمان کی تاثیر زمین پر غالب آگئی۔ اب خدا کی سلطنت سے کیا مراد ہے؟ خدا کی سلطنت سے یہاں خدا کی مرضی کا بجا لانا مراد ہے زمین پر اکثر خدا کی مرضی پوری نہیں ہوتی۔ بلکہ شیطان ہی کی مرضی پوری ہوتی ہے مگر بپتسمہ کے وقت روح القدس اپنی پاک تاثیر کرنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ شیطان کی سلطنت دفع اور خدا کی

سلطنت قایم ہونے لگتی ہی اور جس قدر ہمارے دل اور رفتار و گفتار خدا کی مرضی کے مطابق ہوتے جاتے ہیں اُسی قدر خدا کی سلطنت ہم میں قایم ہوتی ہی اور ہم اُس کے وارث ہوتے جاتے ہیں ❊

مگر اس زندگی میں وہ سلطنت صرف ہمارے دلوں ہی میں ظاہر ہو سکتی ہی بلکہ ہمارے دل بھی کامل طور پر اُس کے قابو میں نہیں آ سکتے۔ لیکن اُس جہان میں نہ صرف ہمارے دلوں ہی میں کوئی ایسی جگہ یہ باقی رہیگی جہاں خدا کی سلطنت نہو بلکہ ہمارے بدن بھی پھر زندہ ہوکر اُس کے قبضہ میں آجائینگے اور چاروں طرف نئی زمین اور نئے آسمان ہونگے جن میں خدا کی مرضی بالکل پوری اور اُس کی سلطنت کامل طور سے قایم ہوگی دیکھو ۲ پطرس ۳: ۱۳۔ اُس پر جلال عاقبت کے ہم اب اُمیدوار ہیں پر دونوں طور پر ہم بپتسمہ کے وسیلہ سے آسمان کی سلطنت کے وارث بن گئے ہیں ❊

۳۔ کاٹکزم کے تیسرے سوال کا جواب یہہ ہی کہ میرے دھرم باپ اور دھرم ماں نے میرے بپتسمے کے وقت تین باتوں کا وعدہ اور عہد کیا تھا پہلے یہہ کہ میں کچھ ترک کروں گا دوسرے یہہ کہ میں کچھ یقین کرونگا تیسرے یہہ کہ میں کچھ کام کرونگا۔ کس کو ترک کروں؟۔ جو کچھ بُرا ہی۔ کس کا یقین کروں؟ جو کچھ خدا نے منکشف کیا ہی۔ کونسا کام کروں؟ جس کا خدا نے حکم دیا ہی۔ ترک کرنے سے یہاں یہہ مطلب ہی کہ کسی چیز سے اپنے دل میں ایسی نفرت کی جائے کہ اُس سے بالکل الگ رہنے کا قصد کیا جائے۔ اگر ہم اُس میں اب مبتلا ہوں تو اُسے بالکل اور ہمیشہ کے لئے چھوڑنیکا قصد کریں۔ اور اگر ہنوز اُس میں مبتلا نہ ہوئے ہوں تو یہہ قصد کریں کہ کبھی اُس میں نہ پھنسیں گے۔ اس مقام پر تین بُری چیزوں کا ذکر ہی جنکے ترک کرنے کا وعدہ

میرے بپتسمہ کے وقت ہوا تھا۔ ایک شیطان دوسری دُنیا تیسرا جسم۔ شیطان کے ساتھ
اُس کے سب کام مذکور ہیں۔ یعنے وہ سب بُتوں کا [illegible] کو
اور اُن کاموں کو ہر طرح سے اور بالکل ترک کرنا چاہیے [illegible]
جیسے یوحنا ۳: ۸ سے صاف ثابت ہوتا ہے۔ پس نہ اُس کے کاموں [illegible] صبر کرنا چاہیے
نہ اُس سے کسی طرح کی اِصلاح کی اُمید رکھنی چاہیے بلکہ ہمیشہ اُس کا مقابلہ ہی کرنا چاہیے یعقوب
۴: ۷ میں حکم ہے۔ نہ اُس کی کوئی بات سننی واجب ہے نہ اُس سے کوئی بات کہنی۔ بلکہ
اُسے محض موذی اور عین جانی دشمن جان کر اُس سے لڑنا اور اُس کے دور کرنے ہی کی کوشش
کرنی واجب ہے۔ لیکن دُنیا اور جسم کو اس طور سے ترک کرنا ہم پر فرض نہیں۔ کیونکہ
دُنیا میں بھلائی اور بُرائی دونوں ہوتی ہیں اور جسم نہ بھلا ہے نہ بُرا بلکہ ہماری روحوں کا گویا محل
مکان اور ہتھیار ہے۔ خودکُشی کے بغیر ہم اور کسی طرح سے دُنیا یا جسم کو پورے طور سے ترک
نہیں کر سکتے اور یہ گناہ ہے۔ بلکہ شیطان ہی کا کام ہے۔ تاہم اگرچہ ہم دُنیا اور جسم کو ترک
نہیں کر سکتے لیکن اُن کی حکومت کو ترک کر سکتے ہیں۔ اور یہ کرنا ہم پر نہایت ہی فرض ہے
وہ ایک ہی ذات ہے جس کی ہر حالت میں حکومت ماننی اور جس کا تابعدار اور پیرو رہنا
اور جس کو اپنی ساری رفتار و گفتار میں اپنا مقصد قرار دینا اور اپنے دل کا محبوب جاننا چاہیے
اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اگر اُس کے سوا اُس کی عوض کسی چیز کو ہم ایسا سمجھیں تو وہ ہمارے
لیے بُت ہوگی۔ ممکن ہے کہ وہ چیز بذاتہ بہت ہی خوب اور پسندیدہ یا تابعداری کے لائق
ہو مگر جب وہ ہمارے دل میں خدا کی جگہہ پر قائم ہو یہاں تک کہ ہم خدا کو بھول کر اُس چیز
کے لیے سب کام کرنے اور سب تکلیفیں اُٹھانے کو تیار رہیں تو وہ ہمارے لیے بُت ہوگی

اور ہم بت پرست ٹھہرے۔ مثلاً دُنیا میں ہمارے ماں باپ اور بال بچے ہیں اور اُن سے محبت
رکھنی گنا[illegible]دا کی نسبت اُن سے زیادہ محبت رکھیں اور اُن کے پیار کرنے کے
سبب [illegible]ریں تو ہم دنیا دار ٹھہرے دیکھو متی ۱۰: ۳۷ کو اسی طرح روپیہ
بھی اچھی چیز ہے اور اُس کے جائز استعمال سے خدا کا جلال ظاہر ہوتا ہے مگر جب ہم زرپرست
ہو کر روپیہ کمانے کے لئے سب طرح کی تکلیف اُٹھائیں بلکہ اپنی روحانی بہتری کھو دینی منظور کریں تو
ہم دنیا دار ٹھہرے اسی واسطے ۔ ا قرنتیوں ۷: ۳۱ میں یہہ حکم ہے کہ جو دنیا کو کام میں لاتے ہیں وہ خبردار
رہیں کہ اُس کو بُرے طور سے استعمال نہ کریں اور اُسکا بُرا استعمال اُسوقت ہوتا ہے جب ہم اُسکو اپنا
غلام نہ سمجھیں بلکہ خود اُسکی غلامی کرنے لگیں چنانچہ ا یوحنا ۲: ۱۵ میں یہہ حکم ہے کہ نہ دُنیا سے محبت
رکھو نہ اُن چیزوں سے جو دنیا میں ہیں اور یہہ بھی لکھا ہے کہ جو کوئی دنیا سے محبت رکھتا ہے اُس میں باپ
کی محبت نہیں ۔ اور یعقوب ۴: ۴ میں بھی لکھا ہے کہ جو کوئی دنیا کا دوست بننا چاہتا ہے وہ اپنے آپکو خدا کا
دشمن بناتا ہے ۔ اِن دونوں مقاموں کا حاصل وہی ہے جو ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ دُنیا کی چیزوں اور شخصوں کو
صرف خدا کا مظہر اور اُس کی عبادت کا وسیلہ جان کر اُن سے دل لگانا جائز ہے اور خدا کو بھول کر
اُنہیں اپنے دلوں کا محبوب و مقصود ٹھہرانا وہی گناہ ہے جس کے ترک کرنے کا ہمارے بپتسمہ کے
وقت وعدہ ہوا تھا۔ اِس مقام پر جو دُنیا کی دھوم دھام اور واہیات باتوں کو ترک کرنے کا
ذکر ہوا تو اُس کا یہہ مطلب ہے کہ جب خدا کے سوا دنیا ہمارے دل کا مقصود ہوئی تو وہ بالکل
واہیات چیز ٹھہری جس سے ہمارے دل ہرگز آسودہ نہیں ہو سکتے ۔

پھر جسم اور اُس کی خواہشیں بذاتہ ترک کرنے کے لائق نہیں بلکہ جسم کا پالنا اور پرورش
کرنا ہمپر فرض ہے (دیکھو افسیوں ۵: ۲۹ کو) لیکن جب ہم اُس کو اپنا عزیز غلام نہ سمجھیں اور خود

اُس کی غلامی کرنے لگیں اور جسمانی خوشی کے لئے خدا کا گناہ کریں اور اپنی روحانی بہبودی اور نجات کو کھودیں تو یہہ وہی کام ہے جس کے کرنیکا ہمارے بپتسمہ لرانا چاہئے [illegible]۔

وہ سوار اچھا نہیں جو اپنے گھوڑے کو ہمیشہ روکے رکھے بلکہ اچھا وہ ہے جو اُسے اپنے ہاتھ میں رکھے اور گھوڑے کی تیزی سے اپنا مطلب نکالے اور جب تک وہ سوار کی مرضی کے مطابق چلے اُس کو جتنا چاہے اُتنا تیز رَو ہونے دے۔ مگر جب اُس کی تیزی سوار کی دانست میں ذرا بھی زیادہ ہونے لگے یا وہ اُس کو دوسرے راہ سے لیجانا یا واپس لوٹانا چاہے تو فوراً سوار اُسے قابو میں کرے تاکہ گھوڑا اُس کی تابعداری کرے۔ اِسی طرح مسیحی شخص کو اپنا جسم قابو میں رکھنا چاہئے۔ چونکہ خدا نے چند قسم کی خواہشیں اِنسان میں پیدا کی ہیں اِس لئے اُن میں سے کوئی بذاتہ بُری نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب ہم اُن کو قابو میں نہ رکھیں اور اُنہیں حد سے زیادہ بڑھنے یا بے موقع پورا ہونے دیں تو وہ ہمارے لئے وہی بدخواہشیں بنجاتی ہیں جن کے ترک کرنے کا وعدہ ہمارے بپتسمہ میں کیا گیا ہے +

دوسرے اور تیسرے وعدہ کی تفسیر آگے ہوگی +

۴۔ کاٹکزم کے چوتھے سوال میں یہہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم نہیں سمجھتے کہ جس طرح اُنہوں نے تمہاری طرف سے وعدہ کیا تھا اِسی طرح تمہیں ایمان رکھنا اور عمل کرنا فرض ہے۔ اور اِس کا یہہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہاں بیشک خدا کی مدد سے ایسا ہی کرونگا۔ لیکن اب اِس کا مطلب کیا ہے؟ جو کچھ کسی نے میری طرف سے وعدہ کیا ہو کیا اُس کو پورا کرنا میں اپنے اوپر فرض سمجھوں؟ ہرگز نہیں یہہ تو محض غلامی ہوئی۔ جو وعدہ اور کسی نے میری طرف سے کیا ہو اُس کا میں صرف اُسی وقت پابند ہو سکتا ہوں جب وہ ایسے کام کا وعدہ ہو جو بغیر اُس کے

بھی ہر حال میں مجھ پر فرض ہو۔ مثلاً فرض کرو کہ تمہارے باپ کو تمہیں نوکر کرانا منظور ہو اور وہ کسی شخص کے پاس جاکر تمہارا ذکر کرے اور وہ شخص جواب میں کہے کہ میں تمہارے بیٹے کو نوکر رکھونگا مگر اس شرط پر کہ جب میں لین دین کروں تو وہ میری مدد کرے اور میرے نفع کے لئے جھوٹ بولنے سے بھی انکار نہ کرے۔ یہہ سنکر تمہارا باپ کہے کہ اچھا میرا بیٹا ایسا ہی کریگا۔ ہر امر میں آپ کا تابع رہیگا۔ تو کیا اپنے باپ کے اس وعدہ کو پورا کرنا تم پر فرض ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ گناہ ہے۔ اور اگر وہ شخص یہہ کہے کہ میں اس شرط پر تمہارے بیٹے کو نوکر رکھونگا کہ وہ میرے کام میں چست و چالاک رہے اور جو عزت آقا کی کرنی چاہئے وہ میری عزت کرے اور بھلائی سے دل لگاکر کام کرے اور تمہارا باپ وعدہ کرلے کہ ہاں میرا بیٹا ایسا ہی کرے گا تو کیا تم اس وعدہ کے پابند نہوگے؟ بیشک ہوگے۔ کیونکہ ایسا چال چلن رکھنا تمام بنی آدم کو ہر حالت میں لازم ہے۔ اسی طرح جب تم مسیح کے عضو اور خدا کے فرزند اور آسمان کی سلطنت کے وارث بنے تو ان نعمتوں کے حاصل ہونے کے سبب تم پر یہہ فرض ہوگیا کہ جس چیز سے خدا نفرت کرے اس کو ترک کرو اور جو کچھ تم پر ظاہر کرے اس کو سچ مانو اور جو کچھ حکم کرے اس پر عمل کرو۔ اگر تمہارے دھرم ماں باپ نہ ہوتے اور بپتسمہ کے وقت کوئی وعدہ نہ کیا جاتا تو بھی یہہ باتیں تم پر فرض ہوتیں۔ مگر چونکہ بپتسمہ کے وقت صاف طور سے یہہ وعدہ کیا گیا تھا اس لئے تم ان فرائض سے ناواقف نہیں رہ سکتے اور ان کے پورا نہ کرنے کا کوئی عذر نہیں کرسکتے۔

اس کے بعد شاگرد اپنے آسمانی باپ کا شکر کرتا ہے کہ اس نے مجھ کو نجات دہندہ کے وسیلے سے نجات کی اس حالت کے لئے بلایا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اور جب میں نجات کی

حالت میں ہوں تو خدا کی منت کیوں کرتا ہوں کہ اُس کے فضل سے میں عمر بھر اسی حالت میں
قایم رہوں؟ یعنے جب میں نجات پا چکا تو آیندہ کے لئے دہشت کی کیا وجہ ہی؟ یہہ بات
بنی اسرائیل کے احوال سے بخوبی سمجھ میں آسکتی ہی۔ جب خدا نے انہیں مصر سے رہائی دی تھی تو
وہ فی الحقیقت نجات پا چکے تھے یعنے اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے چھوٹکر بالکل آزاد ہو گئے تھے
لیکن کیا اپنی منزل مقصود کو پہنچ چکے تھے؟ ہرگز نہیں۔ وہ تو بیابان ہی میں تھے اور وہاں طرح طرح
کی تکلیف اُٹھاتے تھے اُن کی آرام گاہ اور جائے مقصود کنعان کا ملک تھا وہیں پہنچکر وہ کاملی
اور پوری نجات حاصل کر سکتے تھے پس جو نجات مصر سے چھوٹتے ہی اُنہیں حاصل ہوئی وہ
حقیقی نجات تھی لیکن کامل نہ تھی اور جب تک اُنہیں کامل نجات نہ ملی تھی اُس وقت تک وہ
ناکامل نجات بہت کام کی نہ تھی بلکہ اگر کامل نجات اُن کو نہ ملتی ناکامل نجات بیفائدہ ہی رہتی۔ اسی
طرح بپتسمہ کے سبب سے جو ہماری اچھی حالت ہو گئی ہی وہ فی الحقیقت بڑی نجات کی حالت ہی اور
اُس کے سبب خدا کا شکر ہر روز دل وجان سے کرنا چاہئے۔ لیکن اگر ہمارا حال ہمیشہ ایسا ہی
رہے جیسا اب ہی اور جس کامل نجات کا خدا نے اپنے دوستوں اور ایمانداروں سے وعدہ کیا ہی
وہ ہمکو کبھی حاصل نہو تو حال کی نجات سے کیا فائدہ ہوا؟ بہت ہی تھوڑا ہوا۔ اسواسطے شکر گذاری
کے سوا بڑی منت کیساتھ خدا سے دعا مانگنی بھی چاہئے کہ جو نجات ہمکو مل چکی ہی اس کے فائدہ کو نہ
کھودیں۔ بلکہ اس طرح راہ راست پر چلتے رہیں کہ اُس کامل نجات سے جو آیندہ ملیگی محروم نرہیں
چنانچہ عبرانیوں ۳: ۸ سے لیکر ۳: ۱۹ تک نہایت غور کے لایق ہی اسمیں لکھا ہی کہ اکثر بنی اسرائیل
بیابان میں ایسی نالایق چال چلے اور اپنی بے ایمانی سے خدا کا غضب ایسا بھڑکایا کہ باوجود مصر
سے نجات پانے کے اُن کو کچھ فائدہ نہوا بلکہ وہ بیابان ہی میں مارے پڑے اور ملک کنعان

کی کامل نجات اور آرام اُنہیں کبھی حاصل نہ ہوا۔ اسی طرح ہم بھی اگرچہ خدا کے بڑے فضل سے شیطان کی غلامی سے چھُوٹ تو گئے ہیں۔ مگر اپنی بے ایمانی اور اور گناہوں کے سبب سے آسمان کے جلال اور ابدی آرام سے محروم رہ سکتے ہیں کیونکہ یہہ بات نہایت ہی غور اور یاد رکھنے کے لایق ہے کہ لڑکوں اور بڈھوں کے سوا جتنے مرد بنی اِسرائیل کے مصر سے نکلے اُن میں سے دو ہی کنعان میں پہنچے یعنے کالب اور یشوع۔ موسیٰ اور ہارون بھی محروم رہے۔ اِن دو کے سوا باقی سب بیابان میں ہلاک ہوئے اور مصر سے نجات پانی اُن کے لئے عبث ہوئی۔ یہہ ہمارے لئے کیسی خوفناک بات ہے۔ ہم یہہ تو نہیں کہہ سکتے کہ چھ لاکھ بپتسمہ یافتوں میں سے صرف دو ہی آدمی ابدی نجات پائینگے۔ مگر جتنی دور انسان کی نظر پہنچ سکتی ہے اُس سے یہہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جتنے بپتسمہ پاتے ہیں اُن میں سے ہلاک بہت ہوتے ہیں۔ اِسی واسطے شکرگذاری کے ساتھ یہہ بھی نہایت ضرور ہے کہ ہم خدا کی روز بروز منت کیا کریں کہ وہ ہم کو وفادار و استوار رکھے۔ تاکہ جو نجات ہم کو مل چکی ہے اُسے کھو نہ دیں بلکہ گناہ سے بچکر اُس کی ابدی آرام گاہ میں داخل ہوں +

سبق (۲) عقیدہ کے بارہ میں

(۱) تم نے کہا ہے کہ میرے دھرم باپ اور دھرم ماں نے میرے بپتسمہ کے وقت میری طرف سے یہہ دوسرا وعدہ کیا ہے کہ میں مسیحی دین کے سب مسئلوں پر اعتقاد رکھونگا یعنے مسیحی ہونے کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ہم اپنا چال چلن درست رکھیں بلکہ ہمارا اعتقاد بھی درست ہونا ضرور ہے۔ بعض لوگ یہہ سُنکر کہتے ہیں کہ اِس کی کیا ضرورت ہے؟

کیا سب مذہبوں سے خصوصاً مسیحی مذہب سے یہہ مقصد نہیں کہ ہماری رفتار و گفتار درست ہو جائے ؟ اور جب یہہ مقصد حاصل ہو چکا ہو تو عقاید سے کیا مطلب رہا ؟ کیا ان سے دل حیران و پریشان نہیں ہوتا ؟ اس اعتراض کا جواب یہہ ہے کہ ایک تو ہم یہہ نہیں مان سکتے کہ مسیحی دین کا مقصد صرف اِسی زندگی کی رفتار و گفتار کا درست کرنا ہے اگر ہم بالفرض مان بھی لیں تو ہم تسلیم نہیں کر سکتے کہ مسیحی رفتار و گفتار بغیر مسیحی عقاید کے جاننے اور ماننے کے وقوع میں آسکتی ہے - کیونکہ مسیحی دین کی اصل خدا کے اُن چند اقوال و افعال کا مجموعہ ہے جو ہم پر منکشف ہوئے ہیں اور جو رفتار و گفتار بغیر اِن اقوال و افعال کے جاننے اور اُن سے موثر ہونیکے وقوع میں آئے خواہ وہ درست ہو خواہ نادرست مسیحی رفتار و گفتار نہیں ہو سکتی - کیونکہ جیسی بنیاد ہوگی ویسی ہی عمارت ہوگی - جیسا چشمہ ہوگا ویسا ہی دریا بھی ہوگا - دیکھو رسولوں کے خطوط خاصکر رومیوں گلتیوں افسیوں اور کلسیوں کے ان میں رسول نے پہلے مسیحی دین کے عقاید کا مفصل بیان کیا اس کے بعد مسیحی چال چلن کے احکام کو گویا ایک پختہ و پائیدار بنیاد پر قایم کر کے بیان کیا - مثلاً رومیوں کے خط کے پہلے گیارہ بابوں میں رسول نے مسیحی دین کے بڑے بڑے عقاید کو مفصل طور پر بیان کیا اس کے بعد بارہویں باب کی پہلی آیت میں کہتا ہے کہ پس اے بھائیو میں خدا کی رحمتوں کو یاد دلا کر (یعنے اُن رحمتوں کو جو مسیحی دین کے عقاید سے ظاہر ہوئی ہیں) یہاں سے خط کے اخیر تک وہ مسیحی چال چلن کے احکام لکھتا ہے +

پس جب مسیحی عقاید کا اعتقاد ایسا ضروری ٹھہرا تو اُستاد کو یہاں یہہ کہنا مناسب ہے کہ اپنے عقیدہ کے مسئلے سناؤ - یہہ سنکر شاگرد کو وہ عقیدہ پڑھنا چاہیئے جو رسولوں کا کہلاتا ہے - نماز کی کتاب میں تین عقیدے مندرج ہیں - (اُن میں سے دوسرا یعنے نکایا کا اور

تیسر یعنے اتھانس یُس کا) پیچھے تصنیف ہوا اور کم وبیش اِن کے تصنیف ہونیکا وقت معلوم ہی لیکن جو رسولوں کا عقاید نامہ کہلاتا ہی اگرچہ اس میں چند الفاظ ایسے ہیں جو بعد میں درج کئے گئے ہیں مگر تاہم نہایت پرانا ہی بلکہ اُس کی تصنیف کا وقت یا مصنف معلوم نہیں۔ اور رسولوں کا عقیدہ کہلانے کی وجہ یہہ نہیں کہ رسولوں نے مل کر اُس کو تصنیف کیا۔ بلکہ رسولوں نے جو مسیحی دین کے عقاید خداوند مسیح کے حکم اور روح القدس کی ہدایت سے دُنیا میں جاری کئے ہیں ان کا یہہ خلاصہ ہی کیونکہ جیسا آج تک بالغ شخص کے بپتسمہ پانیکی یہہ شرط ہی کہ وہ کلیسیا کے عقیدہ کو تسلیم کرے ویسے ہی پہلے ایام میں بھی ہوتا تھا۔ یعنے جو کوئی بپتسمہ کی درخواست کرتا تھا اس سے مسیحی دین کے بڑے بڑے عقاید پوچھے جاتے تھے اس کے بعد یہہ دستور بھی جاری ہو گیا کہ کلیسیا کے سب شرکا اس عقیدہ کو عبادت کے وقت ایمان کے اقرار کے طور پر پڑھا کریں اس طرح سے یہہ عقیدہ رسولوں کے نام سے مشہور ہو کر آج کے دن تک کلیسیا میں مستعمل ہی +

(۲) اب ہم اِس عقیدہ کی مختصر طور سے تفسیر کرتے ہیں +

میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ اِس کے دو مطلب ہیں ایک تو یہہ کہ میں دہریہ نہیں خدا کی ہستی کو مانتا ہوں دوسرا یہہ کہ میں بیٹے اور روح القدس کے سوا خدا کو باپ بھی مانتا ہوں جیسا آگے صاف بیان ہوگا۔ لیکن فی الحقیقت ان دونوں مطلبوں کا حاصل ایک ہی ہی کیونکہ خدا باپ ہی اُلوہیت کا چشمہ ہی اس لئے لفظ خدا سے جہاں بیٹے اور روح القدس کا ذکر نہو وہاں ہمیشہ خدا باپ ہی مراد ہوتا ہی +

باپ۔ اصل میں خدا باپ صرف ابن وحید کا باپ ہی جو مجسم ہو کر مسیح بنا ہی لیکن

اُس کے سبب سے فرشتوں اور آدمیوں کا بھی باپ ہوا۔ اسی سبب سے جیسا مسیح خدا باپ کا ذکر کرتا ہی تو اُسے کہیں میرا باپ کہتا ہی۔ کہیں تمہارا باپ۔ کہیں صرف باپ یعنی مطلق طور پر۔ دیکھو افسیوں ۱۴:۳ و ۱۵ کو ✦

قادر مطلق۔ یعنے جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہی اُسے کر سکتا ہی البتہ جو کام اُس کی باقی صفات کے خلاف ہوں اُس کو نہیں کر سکتا۔ مثلاً جھوٹھ نہیں بول سکتا دیکھو طیطس ۱: ۲ و عبرانیوں ۶: ۱۸ کو۔ لیکن جس کام کا وہ ارادہ کرے کہ میں اُسے کرونگا وہ بالضرور کرے گا۔ کیونکہ کوئی دوسری شے ایسی قادر نہیں جو اُسے روک سکے یا جو وہ کرنا چاہے اُسے نہونے دے۔ یہاں اُن کاموں کا ذکر نہیں جو وہ ہم سے کرانا چاہتا ہی کیونکہ اُن کو اُس نے ہمارے اختیار پر چھوڑ دیا ہی اور اُن میں اُس کی قدرت دخل نہیں دیتی مگر جو کام وہ آپ کرنا چاہے اُس کو کوئی نہیں روک سکتا دیکھو پیدایش ۱۸: ۱۴۔ یرمیاہ ۳۲: ۱۷ و ۲۷ و لوقا ۱: ۳۷ و ۱۸: ۲۷ کو ✦

آسمان و زمین کا خالق۔ (دیکھو پیدایش ۱: ۱) آسمان و زمین سے تمام مخلوقات مُراد ہی یعنے خدا کے سوا جو کچھ موجود ہی کیونکہ زمین کے سوا ہر چیز آسمان میں شامل ہی۔ خدا نے سب موجودات کو کس طرح خلق کیا؟ اس طرح نہیں جس طرح ہم لوگ چیزیں بناتے ہیں یعنے اگر مادہ ہی تو ہم کچھ بنا سکتے ہیں ورنہ کچھ نہیں بنا سکتے بلکہ خدا جہان مطلق کچھ نہیں وہاں سب کچھ بنا سکتا ہی۔ محض اپنی مرضی سے وہ عدم کو وجود عطا کرتا ہی جب کہتا ہی کہ ہو جا تو ہو جاتا ہی (دیکھو عبرانیوں ۱۱: ۳۔ زبور ۳۳: ۶ و ۹ کو) اُس کو خالقیت کہتے ہیں اور اسی واسطے خدا کو خالق قرار دیتے ہیں۔ یہہ بات ظاہر ہی کہ اگر خدا اپنی قدرت مطلقہ سے

بغیر مادہ کے دنیا کو نہ بناتا تو وہ تنہا ازلی نہ ہوتا بلکہ مادہ بھی ازلی ٹھہرتا۔ اور صرف خدا ہی ہمارا معبود نہ ٹھہرتا بلکہ دوسری شئے بھی ہوتی۔

اور یسوع مسیح میں " دیکھو یوحنا ۱:۱۷ کو یسوع ہمارے خداوند کا خاص نام ہی جیسا ہر شخص اپنے کسی نہ کسی خاص نام سے مشہور ہوتا ہے۔ اُس کے زمانہ میں یہودیوں میں بہت عام نام تھا۔ غالباً اس لئے کہ جس بہادر کے وسیلہ سے خدا نے زمین کنعان اُن کے باپ دادوں کو دی تھی اُس کے نام پر بہت سے یہودی لوگ اپنے بچوں کو یسوع پکارتے تھے۔ مگر اُن سب میں سے ایک ہی تھا جس میں اس نام کے معنے۔ یعنی نجات دہندہ پورے ہونے والے تھے۔ فرشتہ نے اس کی نسبت کہا تھا کہ وہ اپنی اُمت کو اُن کے گناہوں سے رہائی دیگا" (متی ۱:۲۱) اور انسان کے گناہ اُن دشمنوں سے بھی سخت تر دشمن ہیں جنہیں یشوع نے جیت کر اُن کا ملک بنی اسرائیل کو دیا تھا۔ لفظ مسیح ہمارے خداوند کا کوئی خاص نام نہیں۔ بلکہ اُس کا لقب ہے۔ مسح کرنے سے مراد کسی شخص کے سر پر اس مطلب کے واسطے تیل ڈالنا ہے۔ کہ وہ اس رسم کے ذریعے سے کسی عہدہ پر مقرر کیا جائے۔ یہودیوں میں یہ رسم سردار کاہنوں (خروج ۲۹:۷ و مزمور ۱۳۳:۲) و بادشاہوں (۱ سموئیل ۱۰:۱ و ۱۶:۱۳ و ۱ سلاطین ۱:۳۹ و ۲ سلاطین ۹:۳) کے تقرر میں مستعمل تھی اور گاہ بگاہ نبیوں کے تقرر میں بھی (۱ سلاطین ۱۹:۱۶) اس سبب سے بادشاہ اکثر خدا کے مسیح یعنی مسح کئے ہوئے کہلاتے تھے (۱ سموئیل ۲۴:۶ و ۲ سموئیل ۱:۱۴ تا ۱۶) اور سردار کاہن بھی کبھی ویسے ہی کہلاتے تھے دیکھو احبار ۴:۳ سے ۱۲ تک شاید نبیوں کا بھی ایسا ہی حال تھا۔ لیکن اسکا کہیں ذکر نہیں۔ الغرض رفتہ رفتہ ایسے ایک آنے والے مرد کی پیش خبریاں صاف ہوتی گئیں

جو نبی (استثنا ۱۸: ۱۵ تا ۱۸) و بادشاہ (یسعیاہ ۳۲: ۱ و یرمیاہ ۲۳: ۵) و کاہن (زبور ۱۱۰: ۴ - و لوقا ۶: ۱۳) ہونے والا تھا اور جس میں تینوں عہدے اپنے پورے مطلب کو پہنچنے والے تھے اس سبب سے خاص وہی آنے والا شخص مسیح کہلانے لگا دیکھو زبور ۲: ۲ و دانیل ۹: ۲۵ کو اور جب ہمارا خداوند زمین پر ظاہر ہوا تو جو لوگ اُس پر ایمان لاتے تھے وہ اِس بات کا یقین کرتے تھے کہ جس بہادر کے بھیجنے کا وعدہ خدا نے مختلف اوقات اور مختلف اطوار پر کیا تھا یہ یسوع ناصری وہی ہے۔ دیکھو متی ۱۶: ۱۵ و ۱۶ و ۲۰ و یوحنا ۹: ۲۲ و اعمال ۱۷: ۳ کو۔ یہودی لوگ تو اب تک یسوع کی مسیحیت کا انکار کرتے ہیں۔ بلکہ ہم میں اور اُن میں خاص یہی فرق ہے۔ پس جب ہم یسوع مسیح کا نام لیتے ہیں تو چاہئے کہ ہم یاد کریں۔ کہ جو آنے والا تھا یہی ہے اور ہمارا مقدم و اعلیٰ بادشاہ کاہن اور نبی یہی ہے ❊

جو اُس کا ابن وحید اور ہمارا خداوند ہے"۔ ہاں "جتنے خدا کی روح کے چلائے چلتے ہیں وہ خدا کے بیٹے ہیں"۔ رومیوں ۸: ۱۴ لیکن ہم خدا کے بیٹے بیٹیاں ذات سے نہیں اور نہ حق سے بلکہ خدا کے فضل اور فعل ہی سے ہوتے ہیں ایک تو خدا اپنی روح میں ڈال کر ہم کو از سرِ نو پیدا کرتا ہے جیسا یوحنا ۱: ۱۲ و ۳: ۳ و ۵ و ۱ پطرس ۱: ۳ و ۲: ۲۹ - وغیرہ میں لکھا ہے۔ اور دوسرے وہ ہم کو دُنیا میں سے لے کر اپنے خاندان میں لے پالک کر کے رکھتا ہے جیسا رومیوں ۸: ۱۵ گلتیوں ۴: ۴ تا ۷ میں ذکر ہے۔ لیکن خدا کے ان دونوں فعلوں کا دائمی بیٹے اس کا ابن ازلی ہے۔ جو کسی خاص وقت میں اُس سے پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ ازل سے ابد تک اس سے ایسا پیدا ہوتا رہتا ہے کہ اس سے علیحدہ شے کبھی نہیں بنتا۔ بلکہ ہمیشہ اس کے ساتھ ایک ہی ذات رکھتا ہے۔ اور چونکہ اُس کی ابنیت ایسی یگانہ ہے اس لئے

اُس کو ابن وحید کہنا درست ہی - دیکھو متی ۱۶: ۱۶ و لوقا ۲۲: ۷۰ و یوحنا ۱۰: ۳۰ و ۳۶ کو پس جب وہ خدا کا ابن وحید ٹھہرا تو بالضرور ہمارا خداوند بھی ثابت ہؤا - دیکھو یوحنا ۲۰: ۲۸ و ۱ قرنتیوں ۸: ۶ کو + ہر طرح سے ہر وقت اور ہر حال میں وہ ہمارا مالک ہی اور ہم اُس کے غلام ہیں اور صرف اُس کی بندگی کرنے سے ہمارا وجود کامیاب ہو سکتا ہی +

وہ "رُوح القدس کی قدرت سے حمل میں آیا اور کنواری مریم سے پیدا ہوا" دیکھو متی ۱: ۱۸ و لوقا ۱: ۳۵ کو - یہہ بھید پہلے پہل مشہور نہیں ہوا - دیکھو یوحنا ۱: ۴۵ و متی ۱۳: ۵۵ کو لیکن رفتہ رفتہ حضرت مریم نے مسیح کے شاگردوں پر یہہ بھید ظاہر کیا ہوگا - اور اس کے ساتھ ساتھ اس عقیدہ کی واجبیت اُن کے دلوں پر عیاں ہوئی ہوگی - یہاں تک کہ آخرکار وہ اُن کے اصول عقاید میں شمار کیا گیا - واجبیت مذکور یہہ ہی کہ جب خدا کا مطلب یہہ تھا کہ ذات انسانی کا کوئی ایسا سر و ہادی و نجات دہندہ ہو جو خود انسان کی خرابی میں مبتلا نہ ہو - اور انسان کی بہتری و ترقی کی ایسی گویا نہر ہو جس میں آب انسانیت بے تبدیل تو ہے لیکن اُس میل اور کیچڑ سے جو اُس سے ملا ہوا تھا - خالص و صاف ہے - تو ایسے مطلب کے برلانے کا کوئی ایسا وسیلہ معلوم نہیں ہوتا جو اِس کے برابر عمدہ و مناسب ہو - کیونکہ ابن اللہ نے حضرت مریم کے رحم میں جو انسانیت لی وہ اُسی مریم کی انسانیت تھی - یعنی وہی شی تھی جو خدا نے آدم میں خلق کی اور اُس سے پشت در پشت چلی آئی تھی - مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کے معمولی طریقہ پر نہیں بلکہ بالکل اعجازی طور پر - اپنی الٰہی قدرت سے وہ انسانیت حضرت مریم سے پیدا کی اِس لئے خدا کے لئے آسان تھا کہ جو خرابی و فساد آدم کی خلقت کے بعد انسانیت میں داخل ہؤا تھا

اُس کو روکے اور مریم کی اولاد میں داخل نہونے دے ۔

"اُس نے پونطیا پیلاطس کی حکومت میں دُکھ اُٹھایا" چونکہ انسان گناہ کے سبب سے دُکھی ہُوا تھا اس لئے ضرور تھا کہ نجات دہندہ بھی اگرچہ خود بے گناہ تھا تو بھی دُکھ اُٹھائے ۔ دیکھو عبرانیوں ۲: ۱۰ و ۱۸ و ۴: ۱۵ و ۵: ۷ تا ۱۰ کو ۔ ہاں پیدایش سے لیکر وہ برابر مردِ غمناک اور رنج آشنا تھا (یسعیاہ ۵۳: ۳) لیکن خصوصاً اپنی زندگی کے اواخر میں پونطیا پیلاطس کی حکومت میں اُس نے زیادہ دُکھ اُٹھایا ۔ مسیح کی پیدایش کے وقت یہودیوں کے اپنے بادشاہ اُن پر سلطنت کرتے تھے لیکن یہہ حال تھوڑے دن تک رہا جب مسیح بارہ برس کا ہوکر پہلی دفعہ فسح کی عید کے لئے ہیکل کو گیا ۔ اُس وقت کے قریب رومیوں نے یہودیوں سے یہہ حق چھین لیا اور اُن کو اپنے بادشاہوں کی حکومت میں نہ رہنے دیا ایک رومی حاکم اُن پر مقرر رہا چنانچہ مسیح کے بپتسمہ کے وقت سے کچھ پہلے جب یوحنا بپتسما منادی کرنے لگا یہی پونطیا پیلاطس جس کی حکومت میں مسیح مصلوب ہوا حاکم مقرر ہوا ۔ دیکھو لوقا ۳: ۱ کو ۔ اس سے دو خاص نتیجے ہوئے ۔ ایک یہہ کہ مسیح کی موت کے گناہ میں نہ صرف یہودی بلکہ غیر قوم والے بھی شریک ہوئے ۔ اور جس حاکم کے حکم سے مسیح قتل کیا گیا وہ اُس زمانہ کی خاص بڑی سلطنت کے سلطان کا نائب تھا ۔ دیکھو ۔ اعمال ۴: ۲۷ کو ۔ دوسرا یہہ کہ مسیح یہودیوں کے دستور کے موافق سنگسار نکیا گیا بلکہ صلیبی موت سے مارا گیا دیکھو یوحنا ۳: ۱۴ و ۱۲: ۳۲ و ۳۳ و ۱۸: ۳۱ تا ۳۲ کو ۔ اور اس طرح سے خدا نے ایسا انتظام کیا کہ قتل کے سب طریقوں میں سے جو زیادہ دردناک (کیونکہ موت جلد نہیں آتی تھی ۔ اور مصلوب آدمی دن بھر بلکہ دو یا تین دن تک تڑپتا تھا) اور زیادہ شرمندگی و رسوائی کا باعث تھا (کیونکہ رومی حاکم رومی مجرموں کو صلیب نہیں دیتے تھے ۔ چنانچہ مقدس پطرس مصلوب ہوا لیکن مقدس پال

جو روحی حقوق رکھتا تھا مصلوب نہیں ہوا۔ خاص اسی طریقہ سے خدا کا ابن عزیز جو تمام بنی آدم میں ایک ہی بیگناہ تھا قتل کیا جائے! اور دُنیا کے بیچ میں تماشے کے طور پر بلند کیا جائے اور نہ اپنی آنکھوں اور نہ اپنے کانوں کو شریروں کے تمسخر و عداوت کے اور اور نشانوں سے بلند کر سکے۔ لیکن ایسے حال میں جب نہ صرف آدمی بلکہ شیاطین بھی اُسے گھیرتے تھے (مزمور ۲۲: ۱۲ و ۱۳ و ۱۶ و لوقا ۲۲: ۵۳) اور خدا کی حضوری اُس سے دور ہو گئی (متی ۲۷: ۴۶) وہ اپنے دونوں بازو صلیب پر پھیلائے رہا تاکہ اپنے سب قاتلوں (یہودیوں اور غیر قوم والوں اور سب قسم کے لوگوں) کو اپنی محبت کے زور سے اپنے پاس کھینچے +

"وہ مصلوب ہوا مارا گیا دفن کیا گیا" مسیح کے مصلوب ہونیکا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں لیکن کیوں اُس کے سوا یہاں یہ بھی بڑھایا گیا۔ کہ وہ مارا گیا؟ اس لئے کہ ممکن تھا۔ کہ کوئی مصلوب ہو کر پھر صلیب پر سے اُتارا جائے اور زندہ رہے جیسے سردار کاہنوں نے ٹھٹھا کر کے مسیح سے کہا۔ متی ۲۷: ۴۲) لیکن ہماری نجات کے واسطے ضرور تھا۔ کہ مسیح نہ صرف صلیب کی بے پایاں اذیت کو اُٹھائے بلکہ موت کا مزہ بھی چکھے + کیونکہ گناہ کی جو خاص سزا شروع سے مقرر کی گئی وہ موت ہے دیکھو پیدایش ۲: ۱۷ و ۳: ۱۹ و رومیوں ۵: ۱۲ و ۶: ۲۳ کو۔ اس سبب سے رسولوں نے مسیح کی اذیتوں کا جتنا ذکر کیا اُس سے بہت زیادہ ذکر اُس کی موت کا کیا دیکھو رومیوں ۵: ۶ تا ۱۰ و ۱ قرنتیوں ۱۵: ۳ و ۴ و ۲ قرنتیوں ۵: ۱۴ تا ۱۵ و فلپیوں ۲: ۸ و کلسیوں ۱: ۲۲ و عبرانیوں ۲: ۹ و ۱ پطرس ۳: ۱۸ و ۱ یوحنا ۳: ۱۶ و مکاشفہ ۵: ۹ کو +

اور مسیح کی موت کے مسئلہ میں سے سب شک دور کرنے کے واسطے یہ بھی بڑھایا گیا ہے کہ وہ دفن کیا گیا۔ کیونکہ فرض کرو کہ اگر سپاہی کی برچھی سے بھی اُس کی زندگی جاتی نہ رہی

بلکہ وہ صرف بیہوشی کی حالت میں صلیب پر سے اُتارا گیا تو بھی جب لوگوں نے اُس کے منہہ کو رومال میں لپیٹ کر اُس کو قبر میں رکھا۔ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ جیتا رہے یہہ بات مسیح کے مومنوں کے لئے بڑی تسلی کا باعث ہے۔ کیونکہ جب موت ہمارے یا ہمارے قرابت داروں کے نزدیک آتی ہے۔ تو ہم یہہ یاد کرکے کہ اس ڈراونی تبدیلی سے۔ جس کا تجربہ ہم نے خود نہیں کیا ہمارا نجات دہندہ بخوبی واقف ہے تسلی پذیر ہو سکتے ہیں ۔

"وہ عالم ارواح میں اُترا"۔ اس فقرہ کا بھی ایک مطلب وہی ہے جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔ کہ مسیح فی الحقیقت مرا۔ کیونکہ جب اُس کی انسانی روح اُس کے بدن سے جدا ہوکر دوسرے عالم میں گئی تو کس طرح ممکن ہے۔ کہ اُس کی موت مجازی ہو؟ لیکن اس کے سوا یہہ نتیجہ بھی اس فقرہ سے نکلتا ہے کہ اس سے یقین ہوتا ہے کہ مسیح فی الحقیقت اور بالکل انسان ہے۔ یعنی بعض نادان لوگ جو گمان کرتے ہیں۔ کہ مسیح کی انسانیت میں صرف بدن تھا۔ اور اُس کی اُلوہیت اُس کی روح کا کام دیتی تھی۔ وہ باطل ہے جس طرح کہ ہماری ارواح ہمارے جسموں سے جدا ہیں اور موت کے وقت اپنے عالم میں داخل ہوتی ہیں اور قیامت کے روز تک وہیں رہینگی۔ اسی طرح مسیح اُلوہیت کے علاوہ انسانی روح بھی رکھتا تھا اور موت کے وقت یہہ روح بنی آدم کی ارواح کے عالم میں گئی۔ اور جب تک وہ جی نہ اُٹھا وہیں رہی ۔ لیکن اُترنے کا لفظ یہاں کیوں مستعمل ہوا؟ شاید کہ گذرے زمانہ میں لوگ گمان کرتے تھے کہ بے جسم روحوں کا عالم زمین کے نیچے ہے۔ لیکن اس کے سوا ایک اور سبب ہے۔ جس کے باعث ہم بھی اس لفظ کا استعمال کرسکتے ہیں ۔ خدا نے انسان کو جسم کے ساتھ خلق کیا ہے۔ پس جتنے خیالات و افعال و حرکات اُس کی روح کرتی ہے۔ اُن کو وہ بدن ہی کے وسیلہ سے کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم سمجھ نہیں سکتے

کہ ہماری روح اپنے تمام کاموں میں سے کوئی کام جسم کے بغیر کیونکر کرسکیگی۔ ہم کتاب
مقدس سے جانتے ہیں۔ کہ غیر مجسم کی حالت بالکل بے ہوشی اور بے حرکتی کی حالت تو نہیں
ہے۔ مگر پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سب طرح کی حرکتوں کی قوت مجسم کی نسبت بہت ہی کم
ہوتی ہے۔ اور اس سبب سے غیر مجسم آدمی کی حالت تنزل کی حالت ہے۔ حالانکہ سچے مومنین
جب مرتے ہیں اسی وقت گناہ اور تکلیف سے رہائی پاتے ہیں۔ تاہم ان کی روح کی برہنگی
کے سبب سے (دیکھو ۲ قرنتیوں ۵: ۲ تا ۴ کو) ان کی قوت بہت ہی کم ہوتی ہے اور ان
کا حال رو بہ تنزل ہوتا ہے۔ اس طرح مسیح نے بھی اگرچہ صلیب پر اپنی جان دی تو پھر کبھی
دکھ نہیں اٹھایا اور نہ ہمارے گناہ کا باربردار رہا۔ تاہم پہلے سے اس کا زیادہ تنزل ہوا۔
اس کی اذیت تو ہمیشہ کے واسطے ختم ہوئی۔ لیکن تنزل کا آخری درجہ ابھی واقع ہوا۔
اس قدر ضرور تھا کہ مسیح گنہگار انسان کے سب تجربات میں سے گذرے۔ اگرچہ ہمیں اس
حالت کی روح بالکل بیکار نہ تھی۔ ہاں اس کے ایک ہی کام کا ذکر کتاب مقدس میں ہوا۔ لیکن
یہہ کام کیسا بھاری تھا۔ (۱ پطرس ۳: ۱۸ تا ۲۰ دیکھو) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو لوگ
حضرت نوح کے ایام میں نا ایمانی کی حالت میں سیلاب میں غرق ہو کر مرے ان کے یا ان
میں سے بعضوں کے پاس مسیح نے بے جسمی کی حالت میں جاکر منادی کی۔ تاکہ وہ خدا
کے کلام پر ایمان لاکر نجات پائیں۔ اس منادی کا نتیجہ ہم نہیں جانتے اور یہہ بھی
نہیں کہہ سکتے کہ ان کے سوا اور مردوں نے کبھی توبہ کرنے کا موقع پایا۔ لیکن جتنا ہم ابھی
کہہ چکے ہیں اس میں کچھ شک نہیں ہوسکتا۔

(د) تیسرے روز وہ مردوں میں سے پھر جی اٹھا۔ یہہ رسولوں کی منادی کا

خاص مضمون تھا دیکھو اعمال ۲: ۲۴ تا ۳۲ و ۳: ۱۵ و ۲۶ و ۴: ۲ و ۱۰ و ۵: ۳۰ و ۱۰: ۴۰ و ۴۱
و ۱۳: ۳۰ تا ۳۳ و ۱۷: ۳ و ۱۸ و ۳۱ و ۱ قرنتیوں ۱۵: ۴ تا ۲۰ کو - بلکہ رسالت کی یہہ ایک ضروری
شرط تھی - کہ رسول مسیح کی قیامت پر گواہی دینگے (دیکھو اعمال ۱: ۲۲ کو) اور اگرچہ اُس کی
ایسی کوئی صاف پیشین گوئی نہ کی گئی تھی کہ جس کے اور معنے نہیں ہو سکتے تھے تو بھی بغیر اِس
کے مسیح کی پیشین گوئیاں سمجھ میں نہیں آتیں - کیونکہ مسیح کے حق میں دو بڑی باتوں کی خبر
صاف دی گئی تھی ایک تو یہہ کہ وہ اذیت اُٹھا کر مریگا اور دوسری یہہ کہ وہ ابد تک پُر جلال
سلطنت کریگا - پس بغیر اُس کی قیامت کے یہہ کیونکر ہو سکتا تھا ؟ دیکھو مزمور ۲۲ و
یسعیاہ ۵۳ کو - اور اُس کے سوا یوناہ پر جو ماجرے گذرے وہ نہ صرف اِس بات کے نشان
تھے - کہ مسیح مدفون ہو کر پھر جی اُٹھیگا - بلکہ اُس کے بھی کہ وہ تیسرے روز جی اُٹھیگا (دیکھو
متی ۱۲: ۴۰ کو) اور جس طرح پر مسیح اِسی طرح اِس کے سب مومنوں پر بھی گویا تین روز گذرتے
ہیں - پہلا روز اُس دُکھ کے اُٹھانیکا جو گناہ کا نتیجہ ہی یہہ دن اسی دُنیا میں گذرتا ہی - دوسرا
روز عالم ارواح میں زیادہ تنزل کا - لیکن اِس میں آرام ہی! اور تیسرا ابدی ترقی و جلال کا ہی +
"وہ آسمان پر چڑھ گیا" دیکھو مرقس ۱۶: ۱۹ و لوقا ۲۴: ۵۱ و اعمال ۱: ۹ و ۳: ۲۱ و افسیوں ۱: ۲۰
تا ۲۳ و ۴: ۸ تا ۱۰ وغیرہ کو - مسیح کی اِنسانیت ایسی کامل ہو گئی - (دیکھو عبرانیوں ۲: ۹
و ۵: ۹ و ۷: ۲۸ کو) اور اِس سبب سے اُس کی اُلوہیت سے ایسی مل گئی ہی کہ اللہ تعالیٰ
کا مقام جو آسمان کہلاتا ہی اُس کا بھی مقام ہوا" اور خدا باپ قادرِ مطلق کی داہنی طرف
بیٹھا ہی" ہم کہہ چکے ہیں کہ ہمارے خداوند کے تین خاص عہدے ہیں - جن کے
سبب سے وہ مسیح کہلاتا ہی یعنی بادشاہ کاہن اور پیغمبر + پس تینوں عہدوں کا کام وہ

اب آسمان پر ایسا کرتا ہی جیسا پیشتر زمین پر نہیں کر سکتا تھا - ایک تو وہ اب پیغمبر ہو کر آسمان پر سے ہم سے بولتا ہی جیسا عبرانیوں ۱۲: ۲۵ میں لکھا ہی دیکھو اعمال ۳: ۲۲ و ۲۳ و ۲۶ کو اور اگر ہم اُس کے شنوا نہوں تو اُن کی بہ نسبت جو زمین پر اس کی نہ سُنتے تھے ہمارا حال زیادہ خطرناک ہوگا + پھر وہ اب آسمان پر ہمارا سردار کاہن ہو کر (جیسا عبرانیوں ۴: ۱۴ و ۶: ۲۰ و ۷: ۲۶ و ۸: ۱ تا ۴ میں صاف لکھا ہی) گویا اپنا خون جو صلیب پر بہایا گیا - اب تعالیٰ کے حضور میں پیش و قربان کرتا ہی - دیکھو عبرانیوں ۹: ۱۱ تا ۲۴ کو اور اپنے اس خون کے بھروسے سے ہمارے لئے شفاعت کرتا ہی - دیکھو عبرانیوں ۷: ۲۵ کو لیکن جس عہدہ کا ذکر یہاں عقاید نامہ میں ہی وہ صرف اس کی سلطنت ہی - جس ۱۱۰ مزمور کی ۴ آیت میں مسیح کی ابدی کہانت کی خبر ہی اُس کی ایک آیت میں اُس کی بادشاہی کا صاف ذکر ہی ظاہر ہی کہ خدا کی دہنی طرف بیٹھنا استعارۃً کہا گیا ہی - یعنی بیٹھنے سے مراد آرام کا ہی اور رب کی داہنی طرف بیٹھنے سے مُراد اعلیٰ درجہ اور شان ہی دیکھو عبرانیوں ۱۰: ۱۱ و ۱۲ کو اور یہہ صرف شان و شوکت نہیں - بلکہ اس کے ساتھ اختیار کلّی بھی ہی جیسا اُس نے خود صعود کیوقت کہا - متی ۲۸: ۱۸ - پس جو مسیح کے ہیں چاہیے کہ وہ اُس کی سلطنت سے نہایت خوش و خورم ہوں +

"وہاں سے وہ زندوں اور مردوں کی عدالت کرنے کو آئیگا" یہہ مسئلہ کہ مسیح آسمان پر سے پھر زمین پر آئیگا - اُس کے کلام اور اُس کے رسولوں کی کتابوں سے صاف معلوم ہوتا ہی - دیکھو متی ۲۴: ۳۰ و ۲۵: ۳۱ و اعمال ۱: ۱۱ و اتسلونیکیوں ۱: ۱۰ و مکاشفہ ۱: ۷ و ۱۶: ۱۵ و ۲۲: ۱۲ تا ۲۰ وغیرہ کو - پھر مسیح سے پیشتر پیغمبروں نے اُس کی آمد کی جو پیشین گوئیاں کی ہیں اُن

میں سے اکثر اُس کی پہلی آمد سے ہرگز پوری نہیں ہوئی مثلاً ملاکی ۳: ۱-۲ و ۴: ۱-۲ میں
جو پیشینگوئیاں مذکور ہیں ان ایسے خاص بڑے واقعات بھی جن سے اُس کی سلطنت
میں بڑی تبدیلی ہوئی اُس کی آمدیں کہلاتی ہیں - جیسے یروشلم کا رومیوں سے تسخیر ہونا دیکھو
متی ۱۶: ۲۸ - لیکن ان سب کے سوا مسیح کے ایسی دوسری آمد کی صاف خبر تمام عہد نامہ
جدید میں پائی جاتی ہے جس میں مسیح ایسا خود اپنی ذات میں آنے والا ہے جیسا ایک بار آچکا ہے
مسیح کی اس دوسری آمد کے کئی مطلب کتاب مقدس میں مذکور ہیں - لیکن جس میں وہ سب
مشتمل ہیں وہ اس فقرہ میں مذکور ہیں کہ وہ زندوں کی (یعنے ان کی جو اُس کی آمد کے وقت
تک جیتے رہیں گے) اور مُردوں کی (یعنے جو اُس وقت تک مر چکیں گے) عدالت کرنے کو آئیگا
دیکھو اعمال ۱۰: ۴۲ و ۱۷: ۳۱ - ۲ قرنتیوں ۵: ۱۰ کو - ہاں مسیح کی پہلی آمد بھی
ایک طرح سے اسی مطلب کے واسطے ہے دیکھو یوحنا ۹: ۳۹ کو لیکن اُس وقت
یہ عدالت خود بخود مسیح سے ہوتی گئی دیدہ دانستہ عدالت کرنے کو وہ اُس
وقت نہیں آیا تھا - جیسا یوحنا ۳: ۱۷ و ۱۲: ۴۷ میں صاف لکھا ہے +
عدالت میں دو چیزیں مشتمل ہیں یعنی ایک تو ہر شخص کا باطنی حال ظاہر کر کے نیکوں اور بدوں میں
تفریق کرنا - جیسا متی ۲۵: ۳۲ و ۳۳ سے ظاہر ہوتا ہے - اور دوم ہر شخص کو اُس کے باطنی
حال اور اُس کی حقیقی لیاقت کے مطابق سزا یا جزا دینی جیسے متی ۱۶: ۲۷ اور دیگر بہت سے
مقاموں سے صاف ظاہر ہے +

" میں روح القدس پر اعتقاد رکھتا ہوں " روح القدس باپ اور بیٹے کے ساتھ حقیقی الٰہی
خدا ہے جیسے اعمال ۵: ۳ و ۴ کے ملانے سے اور اور بہت مقاموں سے ظاہر ہے - پھر وہ متصرف

کوئی آلہی قوت یا تاثیر ہی نہیں بلکہ باپ اور بیٹے کی مانند وہ بھی خود شخصیت رکھتا ہے۔ جیسے اعمال ۱۳: ۲
اور اُن سب مقاموں سے ظاہر ہے جن میں اُس کے بھیجے جانے اور تعلیم یا تسلی دینے اور رنجیدہ
ہونے اور ایسے بہت سے شخصانہ حالات میں سے گذرنے اور افعال کرنیکا ذکر ہے + روح القدس
دنیا کی خلقت سے لیکر اُس میں کام کرتا آیا ہے جیسے پیدایش ۱: ۲ میں ذکر ہے اور پیغمبروں کی زبانی
وہی بولا کرتا تھا۔ دیکھو ۲ پطرس ۱: ۲۱ کو۔ لیکن مسیح کے صعود کے دس دن بعد وہ بالکل نئے اور
خاص طور پر یعنی مسیح کا روح ہو کر دنیا میں کام کرنے لگا۔ جیسے مسیح نے خود پیشتر سے کہا تھا
یوحنا ۱۴: ۱۶ و ۱۷ و ۲۶ و ۱۵: ۲۶ و ۱۶: ۷ تا ۱۵ +

وہ مقدس کاتھلک کلیسیا میں " روح القدس کے جس بالکل نئے اور خاص طور کے کام
کا بھی ذکر ہوا ہے اُس کام کا گویا احاطہ کلیسیا ہے اور یہ اُسی روح القدس کی مخلوقہ بھی ہے + یہاں
تک کہ جس وقت وہ مسیح کا روح ہو کر آیا۔ یعنی پنتیکوست کے روز اُسی وقت کلیسیا بھی پیدا ہوئی
کلیسیا ایک یونانی لفظ ہے اور اس کے لفظی معنے جماعت کے ہیں۔ پس مسیحیوں کی ہر جماعت
کلیسیا کہلاتی ہے۔ دیکھو رومیوں ۱۶: ۵ کو لیکن اس کے سوا تمام مسیحیوں کا مجموعہ بھی (اگرچہ وہ
بسیاری کے سبب ایک جا کبھی نہ ہو سکے اور اگر ہو تو متفرق زبانوں کی وجہ سے ایک زبان
میں عبادت نہ کر سکے) کلیسیا کہلاتا ہے جیسا مسیح کے اُس قول سے ظاہر ہے جو متی ۱۶: ۱۸ میں
لکھا ہے۔ یہی کلیسیا مسیح کا بدن اور اُس کی دلہن ہے دیکھو افسیوں ۵: ۲۳ تا ۲۷ کو۔ پھر اسی
کلیسیا کی دو صفتیں اس فقرہ میں مذکور ہیں یعنی مقدس اور کاتھلک + کاتھلک بھی ایک یونانی لفظ
ہے اور اُس کا اصلی معنے وہ شے ہے۔ جو ہر جگہ میں پائی جاتی ہے + چنانچہ کاتھلک کلیسیا مختلف
خاص خاص کلیسیاؤں سے متفرق ہے + لیکن اس کے سوا اس لفظ کے اصطلاحی معنے بھی

بھی ہیں یعنی کاتلک کلیسیا وہی جو اُن مسئلوں کو جو مسیح اور اُس کے رسولوں نے اُس کے سپرد
کئے ہیں محفوظ رکھتی ہے اور مسیحیوں کے جن مجمعوں میں اُن مسئلوں میں سے بعض محفوظ ہیں اور
بعض مردود اُنہیں کاتلک کلیسیا کی شاخیں نہیں کہہ سکتے + پھر اِس فقرہ میں کلیسیا مقدس بھی
کہلاتی ہے + گو کہ بہت سے مسیحیوں کا چال چلن ناپاک ہے اور کوئی مسیحی اِس جہان میں بالکل مقدس
نہیں + تو بھی کلیسیا کلیتہً مقدس ہے - جیسا اقرنتیوں ۳: ۱۷ میں لکھا ہے - اور اِس کا سبب
یہہ ہے کہ وہ مسیح کا بدن ہے اور روح القدس اُس میں سکونت رکھتا ہے - بلکہ کلیسیا ایسی مقدس
ہے کہ اُس کے سبب سے مفرد مسیحی بھی ایک طرح سے مقدس ہوتے ہیں - چنانچہ رسولوں کے
مکتوبوں میں وہ اکثر مقدس کہلائے ہیں +

"مقدسوں کی شراکت میں" جیسے ہم ابھی کہہ چکے ہیں مقدسوں سے مراد مسیحی لوگ
ہیں + پس سب مسیحیوں کی وہ کونسی شراکت ہے - جو عقاید نامہ میں ذکر کے لایق ٹھہری ہے؟
مسیحیوں میں فرق تو بہت طرح کے ہیں اور اُن میں سے بعض قسم کے فرق بھاری بھی ہیں +
اُن کے وطن اُن کی قومیت اُن کی زبانیں اُن کی دولت اُن کے درجے اُن کی عقلمندی اُن
کے دستور و رسم آپس میں نہایت متفرق ہیں + مگر تاہم جن باتوں میں مقدس لوگ آپس میں
شریک ہیں وہ اُن سب باتوں سے جن میں وہ آپس میں فرق رکھتے ہیں زیادہ قابلِ لحاظ ہیں
اِن باتوں کا مختصر بیان افسیوں ۴: ۴ تا ۶ میں ہوا ہے - دیکھو گلتیوں ۳: ۲۸ و قلسیوں ۳: ۲
کو + رسولوں کے ایام میں جن دو قسموں کے مسیحیوں کی شراکت کو ماننا خاص مشکل تھا - وہ
یہودی اور غیر قوم والے تھے + پس خاص اُنہیں کی یگانگی کا ذکر اُن کے مکتوبوں میں پایا جاتا
ہے - مثلاً افسیوں ۲: ۱۴ تا ۲۲ میں +

اور اس یگانگی و شراکت کا دایمی نشان عشائے ربانی ہی جو اسی سبب سے مقدس شراکت کہلاتا ہی دیکھو قرنتیوں ۱۰: ۱۶ تا ۱۷ کو + ہندوستان میں مختلف ذاتوں کے رواج کے باعث عقاید نامہ کے اس فقرہ کو دل سے تسلیم کرنا مشکل ہی - اور اسی سبب سے اس فقرہ کی ہندوستان میں خاص ضرورت ہی +

"گناہوں کی مغفرت میں" یعنی اس مسئلہ پر اعتقاد رکھتا ہوں کہ خدا تائبوں کے گناہوں کو معاف کرتا ہی - جیسا مزمور ۱۳۰: ۴ و یرمیاہ ۳۱: ۳۴ - میکاہ ۷: ۱۸ و ایوحنا ۱: ۹ - میں لکھا ہی + لیکن یہہ بعضوں کو ایسی آشکارا بات معلوم ہوتی ہی کہ وہ تعجب کرتے ہیں کہ عقاید نامہ کا ایک پورا فقرہ اس بات کے بیان میں کیوں صرف ہوا لیکن فی الحقیقت گناہوں کی مغفرت فقط ایمان کا مسئلہ ہی اور بغیر خدا کے مکاشفہ کے اس کا یقین کبھی کسی کو نہیں ہو سکتا - کیونکہ دنیا میں جہاں تک ہماری نظر پہنچتی ہی جرموں کی معافی نظر نہیں آتی بلکہ آدمی اپنے کاموں کا پھل پاتا ہی - جیسا ہندو لوگ کہتے ہیں + اس لئے ہندو مذہب میں گناہوں کی مغفرت کا مسئلہ مطلق نہیں پایا جاتا ہی - وہ اپنے دیوتوں یا پرمیشور کی دیا پر بھروسہ رکھتے ہیں - لیکن یہہ بھروسہ فی الحقیقت اُن کے مذہب کے برخلاف ہی - کیونکہ جہاں ہر فعل از خود اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہی - وہاں مہربانی کی جگہہ نہیں + اور جب کسی گنہگار کو گناہ کا بوجھ بھاری معلوم ہوتا ہی - تو وہ خدا کی مہربانی پر ہرگز کفایت نہیں کر سکتا - خدا مہربان تو ہی - لیکن وہ عادل بھی ہی - اور اگر مسیح ہمارے لئے قربان نہوتا تو ہماری مغفرت بغیر خدا کے عدل میں خلل ڈالنے کے (جو غیر ممکن ہی) ہرگز نہو سکتی - دیکھو رومیوں ۳: ۲۴ تا ۲۶ و افسیوں ۱: ۷ کو +

"بدن کے جی اُٹھنے پر" صاف ظاہر ہے کہ یہہ مسئلہ محض اعتقاد کا امر ہے۔ کیونکہ بغیر خدا کے مکاشفہ کے کسی کی عقل اُس کو تسلیم نہیں کر سکتی بلکہ غیر مذہب والے فیلسوفوں نے ہر ملک و ہر زمانہ میں ٹھٹھے مار کر اِس مسئلہ کا انکار کیا ہے۔ لیکن جب کوئی سوچے کہ خدا نے انسان کو محض روح نہیں بلکہ جسم بھی دیا ہے۔ تو یہہ اُس کو نہایت معقول معلوم ہوگا۔ کہ انسان کا کمال بغیر جسم کے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جیسے یہہ بدن ہماری گنہگاری اور فساد کا شریک اور وسیلہ ہوا ہے۔ ویسے ہی خدا کا ارادہ ہے کہ اُس کو ہماری آزادی و کمال کا بھی شریک و مددگار بنائے۔ اور چونکہ ہماری نجات کا بانی و پیشوا یعنی مسیح جی اُٹھ کر کامل ہوا اِس لئے اُس کی قیامت بنی آدم کی قیامت کا سبب اور پختہ دلیل ہے۔ دیکھو اعمال ۲۶: ۲۳ و رومیوں ۸: ۱۱ و ا قرنتیوں ۶: ۱۳ تا ۱۴ و ۱۵: ۴۲ تا ۴۹ و ۲ قرنتیوں ۴: ۱۰ تا ۱۱ و ۵: ۱ تا ۵ و فلپیوں ۳: ۲۱ کو۔

"اور ابدی زندگی پر" اِس فقرہ میں دو معنے مشتمل معلوم ہوتے ہیں۔ ایک تو یہہ کہ ہر انسان ابد تک باقی رہیگا۔ اِس کے لئے کافی دلیل یہہ ہے کہ انسان خدا کی صورت میں مخلوق ہوا۔ پس جس پر اُسی کی صورت چھپی ہوئی ہے اُس کا نیست ہونا کیونکر ممکن ہوگا؟ لیکن اِس کے سوا بہت سے مقاموں میں لکھا ہے کہ نیکوں کی خوش وقتی اور بدوں کی بدحالی دونوں ابد تک رہینگی۔ دیکھو متی ۲۵: ۴۶ و رومیوں ۲: ۷ تا ۹ و ۲ تسلونیقیوں ۱: ۷ تا ۹ کو۔ لیکن اِس کے سوا اِس جملہ کے یہہ بھی معنے ہیں۔ کہ مومنوں اور مقدسوں کو ابدی زندگی حاصل ہے۔ کیونکہ کتاب مقدس میں لفظ زندگی محض وجود یا بقا کے معنے میں کہیں نہیں آیا۔ بلکہ صرف ایسے وجود کیواسطے آیا ہے جو خوش وقتی کے ساتھ اور موجود شی کے لائق ہو۔ چنانچہ جو انسان خدا سے پھرا ہوا ہے وہ اگرچہ موجود ہے تو بھی کتاب مقدس کے محاورہ کے مطابق ہرگز زندہ نہیں۔

بلکہ مُردہ ہی - دیکھو اِفسّیوں ۲: ۱ و مکاشفہ ۳: ۱ کو + اس کے مطابق یوحنا ۲۰: ۳۱ میں لکھا ہی - کہ مسیح کے آنیکا یہی مطلب تھا - کہ اِنسان اُس کے وسیلہ سے زندہ ہو جائیں - جیسا وہ آپ یوحنا ۱۰: ۱۰ میں کہتا ہی - اور جو لوگ مسیح کو قبول کرتے ہیں - وہ موت سے نکلکر زندگی میں پہنچ جاتے ہیں جیسا وہ یوحنا ۵: ۲۴ میں کہتا ہی - پس جو لوگ یہہ حقیقی زندگی یعنی اپنی اِنسانیت کی اِس حقیقی خوشحالی کو حاصل کرکے اُس میں قایم رہتے ہیں + وہ اُس کو ابد تک محفوظ رکھتے ہیں + پس جو ابدی زندگی اِس فقرہ میں مذکور ہی وہ یہی ہی +

۴ - عقایدنامہ کے اِبتدا اِس سوال کے جواب میں - کہ اِن مسایل سے تو کونسی خاص باتیں سیکھتا ہی ؟ مقدس تثلیث کا مختصر بیان ہی یعنی عقاید کا یہہ خلاصہ بیان ہوا - کہ خدا باپ خدا بیٹے اور خدا روح القدس پر اعتقاد رکھنا واجب ہی - اِن تینوں میں سے ہر ایک حقیقی خدا ہی - جیسا کتاب مقدس کے بہت سے مقاموں سے ثابت ہی + لیکن تاہم اِن کو تین خدا ہرگز کہنا نہیں چاہئے - کیونکہ خدا کی وحدت دین کی ضروری بنیاد ہی - دیکھو مرقس ۱۲: ۲۹ و ۳۲ و یعقوب ۲: ۱۹ کو + پس اُنہیں کیا کہنا چاہئے ؟ اِس کے واسطے کتاب مقدس میں تو کوئی لفظ نہیں بلکہ ظاہر ہی کہ خدا کی ذات میں جو مخصوصیات ہیں وہ کسی اِنسانی لفظ سے بخوبی بیان نہیں ہو سکتے + لیکن کلیسیا نے اِس کے واسطے لفظ اقنوم پسند کیا ہی + پس ہم تثلیث کے بھید کو اِس طرح بیان کرتے ہیں کہ واحد خدا کی واحد و مشترک ذات میں تین اقانیم ہیں + یہہ مسئلہ کتاب مقدس کے کسی مقام میں صاف صاف بیان نہیں ہوا - بپتسمہ کو جن الفاظ سے مسیح نے مقرر کیا ہی (جیسا متی ۲۸: ۱۹ میں ذکر ہی) اُس سے بخوبی ظاہر ہی - پھر اور بھی بہت سے ایسے مقام ہیں - جن میں تینوں اقانیم کا ایسا ذکر ہوا ہی - جو اُس حال میں

ہرگز نہیں ہوسکتا + جبکہ ہر ایک خدا نہوتا - مثلاً یوحنا ۱۶: ۱۳ و ۱۵ و ۲ قرنتھیوں ۱۳: ۱۴ - ۲ تسلنیقیوں ۲: ۱۳ و ۱ پطرس ۱: ۲ - لیکن ۱ یوحنا ۵: ۷ سے اس مسئلہ میں کوئی دلیل نہیں نکالنی چاہئے - کیونکہ وہ آیت مستند نسخوں میں پائی نہیں جاتی ہے +

لیکن اس جواب میں نہ صرف تینوں اقانیم کے نام مذکور ہیں - بلکہ اُن میں سے ہر ایک کا ایک خاص کام بھی مذکور ہے - خدا باپ کی طرف یہہ خاص کام منسوب ہوا ہے - کہ اُس نے مجھے اور تمام دُنیا کو پیدا کیا + خدا بیٹے کی طرف یہہ منسوب ہوا - کہ اُس نے میرے اور تمام بنی آدم کے واسطے فدیہ دیا - خدا روح القدس کی طرف یہہ منسوب ہوا کہ وہ مجھے اور خدا کے سب برگزیدوں کو مقدس کرتا ہے + خلقت میں تو تمام دنیا شامل ہے - لیکن مسیح کا فدیہ صرف بنی آدم کے واسطے ہے اور روح القدس سب آدمیوں کیواسطے نہیں - بلکہ صرف اُنہیں کو مقدس کرتا ہے جن کو خدا نے باقی بنی آدم میں سے چنا ہے یعنی جن کو اُس نے اپنے فضل سے اپنے پاس بلایا اور اپنے خاندان میں جگہہ دی ہے - یعنی مسیحی لوگوں کو + اس برگزیدگی کا ذکر بہت سے مقاموں میں ہے - مثلاً یوحنا ۱۵: ۱۶ و ۱ پطرس ۱: ۲ میں + جس کو اکثر مقاموں میں بلاہٹ بھی کہتے ہیں مثلاً افسیوں ۴: ۱ و مکاشفہ ۱۷: ۱۴ میں + لیکن بعض مقاموں میں برگزیدگی بلاہٹ کی بہ نسبت کچھ زیادہ کامل شئے معلوم ہوتی ہے - مثلاً متی ۲۰: ۱۶ و ۲۲: ۱۴ میں +

سبق (۳) دس حکموں کے بارہ میں

۱- جو تین عہد خدا سے تمہارے دھرم باپ اور دھرم ماں نے تمہارے بپتسمہ کے وقت کئے تھے - ان میں سے تیسرا یہہ تھا - کہ تم خدا کے سب حکموں پر عمل کرو گے + بعض لوگ کہتے ہیں

کہ مسیحیوں کو حکموں سے کیا کام ہے؟ مسیحی لوگ تو شریعت سے آزاد ہیں۔ جیسا رومیوں ۳: ۲۱ و
۲۲ و ۲۸ و ۴: ۵ و ۱۴ و ۶: ۱۴ و ۷: ۴ گلتیوں ۲: ۱۶ و ۳: ۱۳ و ۵: ۱ و ۱۸ سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن
مسیحی لوگ ایک طرح سے تو شریعت سے آزاد ہیں۔ مگر دوسری طرح وہ اور لوگوں سے زیادہ اُس کے
پابند ہیں۔ شریعت گویا اُن سے الگ ٹھہر کر بے رحم جابر دشمن کی طرح اُن سے اپنے دعوے ڈرا
ڈرا کر نہیں ادا کراتی جیسے اور لوگوں سے کراتی ہے۔ بلکہ روح القدس کی قدرت سے وہ شریعت اُن
کے دلوں پر لکھی جاتی ہے اور اُنکے اندر قیام پا کر اپنے دعوے بڑی شیرینی و ملائمی و خوشی کے ساتھ حاصل
کرتی ہے۔ دیکھو یرمیاہ ۳۱: ۳۳ و مزمور ۴۰: ۸ اور خصوصاً قرنتیوں ۹: ۲۱ میں جو جملہ معترضہ ہے۔ اور یہہ
بھی سوچو۔ کہ گلتیوں ۲: ۱۹ میں جہاں مقدس پولُس کہتا ہے کہ "میں شریعت کے وسیلہ سے شریعت
کی نسبت مرا" وہاں وہ فوراً یہہ بھی کہتا ہے۔ "تاکہ میں خدا کے لئے جیوں" اور رومیوں ۷: ۶ میں
جہاں وہ کہتا ہے۔ کہ "ہم شریعت سے بے علاقہ کئے گئے" وہاں یہہ بھی کہتا ہے "تاکہ ہم لفظ
کی پرانی حالت میں نہیں بلکہ روح کی نئی حالت میں غلامی کریں" یعنی خدا کی۔

پھر یہہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے۔ کہ ہاں ہم اس کا تو انکار نہیں کر سکتے۔ کہ مسیحیوں
کو خدا کے حکموں سے بہت کام ہے۔ لیکن یہہ وہی احکام ہیں۔ جو مسیح اور اُس کے رسولوں نے دیئے
ہیں۔ پس اُن حکموں سے ہم کو کیا کام ہے جو خدا نے مسیح سے قریب ڈیڑھ ہزار برس پیشتر یہودی
قوم کو دئے تھے؟ ہم تو یہودی نہیں ہیں اور اگر ہوتے تو موسیٰ کی شریعت سے ہم کو کچھ مطلب نہ رہتا
کیونکہ یہہ شریعت اب منسوخ ہو گئی ہے۔ جیسے عبرانیوں ۷: ۱۸ و ۸: ۱۳ اور اور مقاموں سے صاف
ظاہر ہے۔ اس اعتراض کا یہہ جواب ہے کہ ہاں موسیٰ کی شریعت میں جو کچھ بذاتہ چند روزہ اور ایک
ہی قوم پر صادق آنے والا یا اور کسی طرح مسیحی دین سے مخالفت رکھتا ہے۔ وہ تو بلا شبہہ منسوخ ہوا ہے

کیونکہ جب افضل شی قایم ہوتی ہے - تو ادنی میں جو کچھ اُس کے ساتھ قایم نہیں رہ سکتا وہ خواہ
مخواہ اُس بہتر شی کے قایم ہونے ہی سے رفع ہوجاتا ہے + لیکن موسی کی شریعت میں بہت کچھ
ایسا ہی جو بذاتہ چندروزہ نہیں - بلکہ دایمی ہے اور صرف ایک قوم پر نہیں بلکہ عموماً بنی آدم پر
صادق آتا ہے - اور خدا کی ذات وصفات سے ایسا متعلق ہے - کہ اُس کے منسوخ ہونے کا
خیال بھی کفر ہے + دس حکموں کا کچھ حصہ چندروزہ ہے - مثلاً ہفتہ کے ساتویں دن کو مقدس
سمجھنا اور اُس کے سوا پانچویں حکم کے ساتھ جو وعدہ ہے اُس کے لفظی معنے صرف اُسی قوم
اور اُسی زمانہ پر صادق آتے ہیں اور دسویں حکم میں جو بیل اور گدھے کا ذکر ہے - وہ لفظاً سب
آدمیوں پر صادق نہیں آتا - مگر پھر بھی ان دس حکموں کی اکثر باتیں بذاتہ دایمی اور تمام
بنی آدم پر صادق آنے والی ہیں اور اس کے علاوہ تین سبب ہیں جن سے یہہ دس حکم
موسی کی شریعت کے باقی سب احکام سے علیحدہ اور اعلی ہیں - اوّل یہہ کہ خدا نے باقی سب
احکام موسی کی زبانی جاری کئے - لیکن ان دس حکموں کو اُس نے خود بغیر انسانی وسیلہ کے
فرمایا - دیکھو خروج ۲۰: ۱۹ و ۲۲ و استثنا ۴: ۳۶ و ۵: ۴ و ۲۲ و ۲۴ تا ۲۷ کو + دوئم
یہہ کہ خدا نے باقی سب احکام موسی کے وسیلہ سے کتاب میں لکھوائے + لیکن ان دس حکموں
کو اُس نے خود پتھر کی لوحوں پر لکھا دیکھو خروج ۳۱: ۱۸ و ۳۲: ۱۵ و ۱۶ کو - اور جب یہہ
ٹوٹ گئیں تو خدا نے اور لوحیں بنا کر حکم دیکر ان پر پھر وہی دس حکم لکھدئیے - دیکھو خروج
۳۴: ۱ و ۴ و ۲۸ کو + سوئم یہہ دو لوحیں خدا کے حکم سے عہد کے صندوق میں رکھی گئیں
اور وہاں کم سے کم ہیکل کی تقدیس کے وقت تک محفوظ رہیں - دیکھو ۱ سلاطین ۸: ۹ کو -
پس یہہ دس حکم اُس عہد کے خاص دایمی نشان تھے - جو خدا نے بنی اسرائیل کے ساتھ

باندھا تھا - دیکھو استثنا ۳۱: ۲۶ کو اور انہیں کے سبب سے وہ صندوق جس میں وہ رکھی گئیں اکثر شہادت کا صندوق کہلاتا تھا +

ہاں یہہ ماننا ضرور ہی کہ دس حکموں کی صورت جو اکثر نہی کی ہی - وہ انجیل سے بالکل نہیں ملتی - کیونکہ جب حکموں پر ڈر کے وسیلہ سے عمل کرانے کی کوشش کی جاتی ہی - تو اُس حال میں حکم اکثر نہی کی صورت پکڑتے ہیں لیکن جب حکم محبت کی بنیاد پر رکھے جاتے ہیں - تو اکثر یہہ نہیں کہا جاتا کہ ایسا مت کرو بلکہ یہہ کہ ایسا کرو + چنانچہ مسیح اور اُس کے رسولوں کے اکثر احکام اسی دوسری صورت پر مبنی ہیں + جب تک لڑکپن رہتا ہی تب تک نہی کے حکموں کی بڑی ضرورت رہتی ہی - اور جس قدر بلوغت قریب آتی ہی اُسی قدر والدین کے حکموں کی صورت بدلتی جاتی ہی - جب بنی آدم طفولیت کے حال میں تھے ضرور تھا کہ خدا کے اکثر حکم نہی کی صورت پکڑیں اور اسی سبب سے دس حکموں کی یہی صورت ہی - لیکن ہم اب بچے نہیں بلکہ مسیح اور روح القدس کی آمد کے سبب بیٹوں اور بیٹیوں کے درجہ تک پہنچائے گئے ہیں (گلتیوں ۴: ۱ تا ۷ کو دیکھو) پس ضرور ہی کہ ہم دس حکموں کا انجیل کی اصطلاح میں ترجمہ کریں - اسکی مقدس پال نے رومیوں ۱۳: ۸ تا ۱۰ میں عمدہ مثال دی ہی + اگر ہم ایسا کریں - تو دس حکم ہمارے فرائض کا بہت مفید خلاصہ معلوم ہونگے + ۲ - اب ہم ان حکموں کی تفسیر کرتے ہیں اور پہلے ان کے اُس دیباچہ کی جو خدا نے ان کے دینے سے پیشتر فرمایا +

"میں خداوند تیرا خدا ہوں - جو تجھ کو مصر کی زمین اور غلامی کے گھر سے نکال لایا" اس دیباچہ کا کیا مطلب ہی ؟ دو مطلب ظاہر ہیں - ایک یہہ کہ جب کوئی ہمارے پاس آکر ہمکو اپنے پاس بُلاکر - ہمکو حکم دینے لگتا ہی - تو ہم فوراً اپنے دل میں پوچھتے ہیں کہ حکم دینے والا کون

ہے؟ ہمکو حکم دینے کا کیا اختیار ہے؟ اگر حکم دینے والا ہمارا باپ یا ماں یا اُستاد یا مالک یا حاکم ہو یا ثابت کرے کہ ان میں سے کسی کی طرف سے بھیجا ہو یا کسی طرح مختار مقرر ہوا ہو۔ تو ہم فوراً حکم کو مانتے ہیں۔ اور اگر نہیں مانتے تو اپنے تئیں قصوروار جانتے ہیں۔ لیکن اگر یہہ معلوم ہو کہ حکم دینے والا بے حق اور بے اختیار ہے۔ تو ہم حکم کا ماننا اپنے اوپر ہرگز فرض نہیں سمجھتے۔ بنی اسرائیل اسوقت مصریوں میں سے نکلے تھے جو بیشمار آلہی کی پرستش کرتے تھے پس ضرور تھا کہ اُن کو بتلایا جائے کہ یہہ حکم کس الہٰ کی طرف سے ہیں؟ اس علم کے بغیر کیونکر ممکن ہوتا کہ وہ ان دس حکموں پر عمل کرنا اپنا فرض جانتے؟ اس شک کو خدا نے یہہ کہکر دور کیا کہ میں وہی ہوں جس نے تم کو مصر سے نکال کر اس سینا تک صحیح وسالم پہنچایا ہے۔ بنی اسرائیل بخوبی جانتے تھے کہ اگر کوئی بڑا قادر ہماری مدد کر کے اور مصریوں کو برباد کر کے اور دریائے قلزم کو دو حصے کر کے بیابان کی سب تکلیفات سے ہم کو نہ بچاتا۔ تو ہم ہرگز یہاں تک نہ پہنچ سکتے۔ پس خدا اب ان سے یہہ کہتا ہے۔ کہ میں وہی قادر خدا ہوں جس نے تم پر اتنا احسان کیا۔ اس قول کا انجیل کی اصطلاح میں یوں ترجمہ ہو سکتا ہے۔ وہ خدا جس نے یسوع ناصری کو دنیا میں بھیجا اور جس کو یسوع ناصری ہمیشہ اپنا باپ کہتا رہا اور جس کا علم اُس نے بنی آدم کو بخشا اسی خدا کے یہہ احکام ہیں۔ خدا ہم کس کو مانیں؟ اپنے خداوند یسوع مسیح کے خدا اور باپ کو جیسے رسول اُس کو افسیوں ۱: ۳ اور دیگر بہت مقاموں میں کہتا ہے۔

دوسرا مطلب یہہ ہے۔ کہ جب ہم حکم پاکر سوچتے ہیں کہ ہم کیوں اس حکم کو مانیں؟ تو اکثر دو سببوں میں سے ایک ہم پر غالب آتا ہے۔ یعنی خوف یا محبت ہم کہہ چکے ہیں کہ خدا نے یہودیوں کو اکثر خوف دلا کر اپنے حکموں کے ماننے کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ دس حکموں کے دینے کے وقت اُس نے سینا پہاڑ پر اُن کو بڑی دہشت دلائی اور دہکتی ہوئی آگ دھوئیں سخت تاریکی زلزلے

گرج بجلیوں اور تُرہی کی آواز کے ساتھ اُن سے بولا۔ علاوہ اس کے ان الفاظ سے خدا نے اپنی نری محبت بھی اُنہیں یاد دلائی اور کہا کہ میں نے تو یہہ سب کچھ تمہارے لئے کیا ہے۔ جس کے تم مطلق لایق نہ تھے۔ مگر میں نے محض اپنے فضل و مہربانی سے یہہ کیا۔ پس اب تم میرے لئے کیا کروگے؟ کیا تم میرے حکموں کو نہ مانوگے؟ اسی طرح ان ڈرانیوالی چیزوں کے دکھلانے سے پیشتر بھی خدا نے اپنی محبت اُنہیں یاد دلائی تھی۔ دیکھو خروج ۱۹: ۳ و ۴ کو۔ اور ظاہر ہے کہ انجیلی اصطلاح میں اس کا یوں ترجمہ ہو سکتا ہے میں نے تم سے ایسی محبت کی کہ اپنے ابن وحید و عزیز کو دریغ نکیا بلکہ تم گناہ گاروں کے واسطے دیدیا۔ کہ وہ تمہارے کفارہ دینے کے لئے ایسی اذیتیں برداشت کرے جو خیال سے باہر ہیں۔ اب تم میرے لئے کیا کروگے؟ کیا اب بھی تم میرے حکموں کو نہ مانوگے؟ دیکھو رومیوں ۵: ۵ تا ۱۰۔ ۲ قرنتیوں ۵: ۱۴ تا ۱۵۔ ۱ یوحنا ۴: ۹۔ ۲ تمی ۲: ۱۱ سے ۱۴۔ یوحنا ۱۵: ۱۲ و ۱۳ و ۱۴ کو *

"تو میرے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہ ماننا" صاف ظاہر ہے کہ یہہ حکم اُن سب حکموں کا ماخذ ہے جو خدا نے دیئے ہیں۔ اِس حکم کا مطلب صرف یہہ نہیں کہ ہم ایک خدا کو مانیں۔ بلکہ سب سے پہلے یہہ ضرور ہے کہ ہم اُسکو پہچانیں۔ ہندو لوگ کرشن کو خدا مانتے ہیں۔ جس نے زمین پر ظاہر ہوکر صرف ظلم و بدفعلی کی۔ پھر وہ برہما کو بھی خدا مانتے ہیں اور اُس کے ساتھ دُنیا کو مخلوط سمجھتے ہیں یعنی کہتے ہیں کہ سوا اس کے اور کوئی شی ہستی نہیں رکھتی لیکن ہم دونوں کا انکار کرتے ہیں۔ اور گو ہندو توحید کو ان کے ساتھ منسوب بھی کریں تاہم ہم کبھی کرشن اور برہما کو خدا نہ مانینگے۔ پس اِس پہلے حکم کا مطلب کیا ہے؟ یہہ کہ جو اُس وقت بنی اسرائیل سے بول رہا تھا۔ جو اُن کو مصر سے نکال لایا تھا۔ اور جس نے مسیح کی معرفت ہم سے

کلام کیا۔ اُسی کو الٰہ ماننا چاہئے اور کسی کو نہیں۔ خواہ وہ ایک ہو یا زیادہ پھر اسکا بھی لحاظ کرنا چاہئے کہ جو کوئی ہمارے دلوں پر حکومت کرتا ہو۔ اور جس کی طرف ہم سب سے زیادہ راغب ہوں وہی ہمارا الٰہ ہے۔ خواہ ہم اُس کو اُس نام سے کہکر اُس کی ظاہری پرستش کریں۔ خواہ صرف دل سے اُسکے پرستار ہوں۔ اور اسی واسطے مقدس یوحنا کی تحریر کہ "اے بچو اپنے آپ کو بتوں سے محفوظ رکھو" سب مسیحیوں کے لئے مناسب نصیحت ہے۔ (۱۔ یوحنا ۱۲:۵)۔

"تو اپنے لئے کھودی ہوئی مورت نہ بنانا" وغیرہ۔ اِس حکم اور پہلے حکم میں فرق یہہ ہے کہ پہلے میں جو شی فی الحقیقت خدا نہیں۔ اسکو الٰہ ماننا ممنوع ہے۔ اور دوسرے حکم میں اُس حقیقی خدا کی مورت یا صورت بنانی ممنوع ہے۔ چنانچہ جب بنی اسرائیل نے بچھڑے کی مورت پوجی تو پہلے حکم کے خلاف نہیں کیا بلکہ صرف دوسرے کے کیونکہ اُنہوں نے اُس بچھڑے کو اسی الٰہ کی صورت سمجھا جو انہیں مصر سے نکال لایا تھا۔ دیکھو خروج ۳۲: ۴ و ۵ کو۔ اور اسیطرح یربعام نے دس فرقوں میں جو بت پرستی جاری کی۔ دیکھو ۱ سلاطین ۱۲: ۲۸ کو) وہ صرف دوسرے حکم کے برخلاف تھی۔ لیکن جب بنی اسرائیل نے بعل یا اور کسی کو معبود مانکر اُس خداوند کو جو اُن کے باپ دادوں کو مصر سے نکال لایا تھا چھوڑ دیا۔ تو اُنہوں نے پہلے حکم کو توڑا۔ اور اُس کے بعد جلد دوسرے حکم کو بھی توڑا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب خدا مجسم ہوا۔ اُس وقت دوسرا حکم منسوخ ہو گیا۔ کیونکہ خدا نے خود انسانی صورت پکڑکر اپنے آپکو بنی آدم پر ظاہر کیا۔ لیکن اگر بالفرض ہم اِس کو تسلیم کریں تو بھی کنواری مریم اور مقدسوں اور فرشتوں کی صورتوں کو پوجنا پہلے اور دوسرے حکموں کے خلاف ٹھہرتا ہے اور صرف مسیح کی مورت کی پرستش بجا معلوم ہوتی ہے۔ مگر فی الحقیقت ہم دلیل مذکور کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے۔ ہاں اگر مسیح اب ہمارے سامنے موجود ہوتا۔ تو بیشک ہم اُس کی پرستش

کرتے - لیکن مسیح کے بدن اور اُس کی بے جان صورت میں جو کسی انسان کے ہنر سے بنائی گئی ہو - زمین و آسمان کا فرق ہے - اور پھر مسیح کی جو صورت بنائی جائے وہ صرف قیاسی ہوگی - کیونکہ اُسکی حین حیات میں کسی نے اُس کی تصویر نہیں اُتاری - اور جن قصوں میں ذکر ہے کہ اُسکی تصویر کھینچی گئی - وہ صدہا سال بعد ایجاد ہوئے - علاوہ اس کے اگر بالفرض ہم یقیناً کہہ سکیں کہ مسیح کی شکل اُس کی پست حالی کے زمانہ میں کیسی تھی تو بھی ایسی صورت پرستش کے لائق نہوگی کیونکہ جو مسیح پرستش کے لائق ہے - وہ ماضی کا نہیں - بلکہ حال کا مسیح ہے - جو آسمان پر ہے مسیح اب اپنے اصلی جلال میں ہے - اور اُس کی جلالی صورت کا قیاس کوئی نہیں کر سکتا +

لیکن ہم کسی طرح کی بت پرستی نہیں کرتے - یہانتک کہ مسیح کی صورت کو بھی نہیں پوجتے پس ہم اس حکم سے کیا سیکھیں؟ اس حکم کے متعلق کونسا گناہ ہے جس کے ہم مرتکب ہو سکتے ہیں یاد رکھنا چاہئے کہ صورت نہ صرف ظاہری ہوتی ہے - بلکہ باطنی بھی یعنی اگرچہ خدا کی کسی ظاہری صورت کی پرستش نکریں - لیکن اپنے دل میں خدا کا ایسا خیال کریں - جو حق نہیں بلکہ باطل گمان پر موقوف ہے - تو ہم دوسرے حکم کو توڑتے ہیں - اور چونکہ ہم خدا کا کسی نہ کسی طرح کا خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتے - اسواسطے نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے - کہ ہم اُسکی نسبت صحیح خیال رکھیں - اور چونکہ ہم کو صرف خدا کے کلام سے معلوم ہو سکتا ہے - کہ اُس کی نسبت کونسے خیالات صحیح اور کونسے باطل ہیں - اِس واسطے ظاہر ہے کہ اُس کا کلام بلاناغہ پڑھنا اور اُس پر غور کرنا اور اپنے سب خیالات کو اسکے مطابق بنانا ہم پر کیسا فرض ہے - ورنہ ہم نادانستہ دوسرے حکم کے توڑنے والے ٹھہرینگے +

"میں خداوند تیرا غیور خدا ہوں" غیرت تو اکثر آدمیوں میں بُری بات ہوتی ہے -

اس لئے بعض لوگ یہہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ خدا کیونکر غیور ہوسکتا ہے؟ لیکن فی الحقیقت غیرت اپنی ذات سے بُری بات نہیں ہے۔ بلکہ محبت کا ایک ضروری نتیجہ ہے۔ اگر کوئی والد اپنے فرزندوں کو دیکھے کہ وہ کسی غیر شخص کو اپنا باپ کہتے ہیں اور اُسی کے پاس ہردم رہتے اور اُسی کا حکم مانتے اور اُسی پر بھروسا کرتے ہیں تو ضرور اُس کے دل میں غیرت پیدا ہوگی۔ ورنہ ظاہر ہوگا کہ وہ اپنی اولاد سے محبت نہیں رکھتا۔ علیٰ ہذا جو شوہر اپنی بی بی کو دوسرے مرد کے ساتھ وہ برتاو رکھتے دیکھے جس کو وہ صرف اپنا حق سمجھتا ہے اور دل میں غیرت پیدا نکرے۔ تو وہ کیسا نالایق شوہر سمجھا جائیگا! پس خدا جو ہماری روحوں کا باپ ہے عبرانیوں ۱۲: ۹ اور یسعیاہ ۵۴: ۵ کے مطابق اُن کا شوہر ہے) جب ہم کو دنیا کی چیزوں میں لپٹے ہوئے دیکھتا ہے تو غیرت کئے بغیر کس طرح رہ سکتا ہے؟ اگر وہ یہہ حال دیکھکر بے فکر رہے تو اُس کی محبت کیونکر ثابت ہوگی؟ لیکن اُس کی اِس غیرت سے گناہ پیدا نہیں ہوتا۔ انسان اکثر بے سبب غیرتمند ہوتا ہے۔ یا اگر اُس کی غیرت کا کچھ حقیقی سبب ہو۔ تو حد سے زیادہ جوش میں آتا ہے۔ یہاں تک کہ خون کر بیٹھتا ہے۔ لیکن خدا انسان کے دلی حالات کو بخوبی جانتا ہے۔ پس وہ بے سبب غیرت نہیں کرسکتا اور نہ وہ حد سے زیادہ کوئی کام کرتا ہے۔

۳۔ "اور باپ دادوں کے گناہوں کی سزا اولاد کو دیتا ہوں"۔ اس پر بھی بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ یہہ انصاف کے برخلاف ہے۔ لیکن خدا کا ایسا کرنا صرف کتاب مقدس ہی سے معلوم نہیں ہوتا بلکہ اُن سب پر صاف ظاہر ہے جو دنیا کی روش پر غور کرتے ہیں۔ جو لوگ شراب خواری اور بدفعلی سے اپنے بدنوں کو خراب کرتے ہیں اُن کی اولاد اُن کی سزا میں ضرور شریک ہوتی ہے۔ اسی طرح جو لوگ نادانی سے اپنے مال کو اُڑاتے ہیں۔ اُن کی اولاد

کنگال ہو جاتی ہے۔ اِس سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اِس کے ساتھ دو باتیں کہنی ضرور ہیں۔
جو سزا اِس طرح اولاد کو ملتی ہے۔ وہ (اگر اولاد کا دل خدا کی طرف رجوع ہو۔) برکت کا باعث ہو
سکتی ہے۔ دیکھو حزقی ایل ۱۸: ۱۴ تا ۱۷ کو۔ اور اگر اولاد باوجود اِس سزا کے توبہ نہ کرے تو عاقبت
میں باپدادوں کے گناہ کی سزا اِس اولاد پر نہ پڑیگی بلکہ صرف اِس کے اپنے گناہوں کی۔ اور یہہ سزا
اُن کے باپ دادوں کی سزا سے ہلکی ہوگی۔ کیونکہ نیکی کرنا اُن کے لئے اُنکے باپ دادوں کی بہ نسبت
مشکل تھا۔ اور پھر خدا گناہ کی سزا کو صرف تیسری چوتھی پشت تک بڑھانیکا ذکر کرتا ہے۔ لیکن جو لوگ
اُس سے محبت رکھکر اُس کے احکام پر چلتے ہیں اُن کے ہزاروں پر وہ رحم کرتا ہے۔ ان الفاظ "اُن
کے ہزاروں پر" کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہہ کہ جب تک اُن کی اولاد بڑھتے بڑھتے ہزارہا
نہیں ہوتی اُس وقت تک خدا اُس پر سے اپنا رحم نہ کھینچیگا۔ دوسرے یہہ کہ اُن کی ہزاروں
پشتوں تک۔ جیسا استثنا ۷: ۹ میں لکھا ہے۔ لیکن اِن دونوں معنوں سے ظاہر ہے کہ خدا کا
رحم اُس کے غضب سے زیادہ دائمی ہے۔ کیونکہ اِن الفاظ کا جو ترجمہ کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ کہ "اُن
میں سے ہزاروں پر" وہ بالکل صحیح نہیں +

"تو خداوند اپنے خدا کا نام باطل طور پر نہ لینا" اِس حکم میں کئی گناہ شامل ہیں۔
پہلے جھوٹی قسم جو ہمیشہ بڑا گناہ سمجھا گیا ہے۔ اور مسیح سکھلاتا ہے۔ کہ ہر قسم میں خدا شامل ہوتا ہے
اور اِس واسطے جھوٹی قسم کا کھانے والا تیسرے حکم کو توڑتا ہے۔ دیکھو متی ۲۳: ۱۶ تا ۲۲ کو اور
دوسرے نہ صرف جھوٹی قسم بلکہ بلا ضرورت قسم بھی اِس حکم میں منع ہے۔ جیسے متی ۵: ۳۳ تا ۳۷ اور
یعقوب ۵: ۱۲ سے صاف ظاہر ہے اور تیسرے نہ صرف غیر ضروری قسم بلکہ کسی طرح سے خدا کا نام
بیجا لینا یا سرسری طور پر بغیر سوچے اُس کا ذکر کرنا اِس حکم میں منع ہے + حاصل کلام اِس حکم میں

خدا کی بے ادبی ممنوع ہی - یہہ بے ادبی نہ صرف خدا کا نام لینے - بلکہ بے ادبی سے اُس کا کلام پڑھنے میں بھی ظاہر ہو سکتی ہی - اور نہ صرف منہہ سے بلکہ ہر عضو سے بھی واقع ہو سکتی ہی - فلپی ۲: ۱۱ تمام اور اور مقاموں سے ظاہر ہی کہ خدا چاہتا ہی - کہ ہم ہمیشہ اس کی شان اور رُعب کو یاد رکھیں اور انہیں بھولکر اُس کی یا جو کچھ اس سے خاص علاقہ رکھتا ہی اُس کی بے ادبی کرنی گناہ ہی +

"خداوند اس کو بے قصور نہ ٹھہراویگا" جیسا وہ خروج ۳۴: ۷ میں بھی کہتا ہی - وہ نہیں کہتا کہ کیا سزا دونگا - بلکہ اس ہولناک دھمکی کو گنہگار کے سر پر ننگی تلوار کی طرح لٹکاتا ہی +

"سبت کے روز کو مقدس رکھنا یاد کر" وغیرہ - ابتدا میں انسان کو خلق کر کے خدا نے ساتویں روز خلقت کے کام سے فراغت کی اور اُس روز کو مبارک و مقدس کہا - ظاہر ہی کہ یہہ برکت و تقدیس انسان ہی کے لئے تھی + چنانچہ مسیح فرماتا ہی کہ انسان سبت کے لئے نہیں (شبت کے معنے آرام ہیں) بلکہ سبت انسان کے لئے مقرر ہوا - مرقس ۲: ۲۷ + خدا جو انسانیت کا بانی ہی جانتا تھا کہ ہفتہ میں ایک دن اپنے معمولی روزمرہ کے کام سے فراغت کرنا دو طرح سے انسان کی صحت کیواسطے ضرور ہی اور یہہ بھی کہ انسان اپنی نادانی سے اپنی حقیقی صحت کا ایسا کم قدردان ہی کہ حکم کے بغیر وہ اپنی خوشی سے ایسی فراغت کبھی نکریگا - ایسی فراغت ایک تو اسکے بدن کی صحت کیواسطے ضروری ہی - چنانچہ ثابت ہو چکا ہی کہ وہ لوگ جو ہفتہ میں ایک روز آرام کرتے ہیں - وہ اُن کی نسبت جو بلاناغہ کاروبار میں مصروف رہتے میں اپنے کاموں میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں + اور دوسرے روحانی صحت کیواسطے بھی ضرور ہی کہ ہفتہ میں ایک روز

کے دستور سے زیادہ خدا کی عبادت کرنے اور اپنی عاقبت کو سوچنے اور اپنی اور اوروں کی روحانی ترقی کے لئے کوشش کرنیکی ہمیں فرصت ملا کرے۔ ان دو قسموں کی صحت میں سے پہلی قسم یعنی آرام کی اس چوتھے حکم میں خاص تاکید کی گئی ہے۔ اور دوسری قسم یعنی روحانی ترقی پر مسیحی کلیسیا کی طرف سے خاص تاکید ہوتی ہے۔ کیونکہ روز ربانی جو ہفتہ کا پہلا دن ہے۔ خدا کے آرام کی یادگاری میں نہیں۔ بلکہ مسیح کے جی اُٹھنے ہی کی یادگاری میں مانا جاتا ہے۔ اور مسیح جو جی اُٹھا وہ صرف آرام کے لئے نہیں۔ بلکہ خدا کا کام بڑی قدرت کے ساتھ کرنے کو اُٹھا ہے۔ جیسا رومیوں ۶: ۱۰ میں لکھا ہے کہ مسیح کو قیامت اور صعود سے سب مشقتوں سے کامل آرام تو ملا ہے۔ جیسا عبرانیوں ۴: ۱۰ میں ذکر ہے۔ لیکن باوجود اس آرام کے وہ زندہ ہے جیسا اسی باب کی ۱۲ آیت میں ذکر ہے۔ بلکہ بنی اسرائیل کا سبت بھی خدا کے ارادہ میں محض کاہلی کا روز نہ تھا۔ بلکہ جیسا خدا خلقت کے کام سے فراغت پا کر فوراً مخلوقات کی حفاظت و انتظام میں (اور جب اس میں خلل پڑا تو اس کی تجدید میں) مصروف ہوا اسی طرح سے مسیح نے یہودیوں پر ظاہر کیا کہ آدمیوں کے جسموں اور روحوں کو صحت بخشنا سبت کے روز جائز ہے۔ دیکھو یوحنا ۵: ۸ و ۹ و ۱۶ و ۱۷۔ اور خروج ۳۱: ۱۳ اور حزقیل ۲۰: ۲۱ اور اس چوتھے حکم میں سب طرح کا کام ممنوع نہیں۔ بلکہ صرف روزمرہ کا معمولی کاروبار منع ہے۔ بنی اسرائیل میں سبت کے روز خوراک کو گھر میں لانا (خروج ۱۶: ۲۷ تا ۲۹) اور اس کے پکانے کے لئے ایندھن جمع کرنا (گنتی ۱۵: ۳۲ تا ۳۶) منع تھا۔ لیکن مسیحیوں کیواسطے ایسا حکم نہیں ہے مگر اسکا سبب یہہ ہے۔ کہ مسیحیوں کو کوئی حکم فروع کی تعین کے ساتھ نہیں دیا گیا۔ انکو صرف اُصول بتلائے گئے ہیں اور اُن کے دل اور ضمیر پر یہہ چھوڑا گیا ہے۔ کہ روح القدس

کی ہدایت سے دریافت کریں۔ کہ وہ اُصول خاص خاص صورتوں میں کس طرح عمل میں آنے چاہئیں۔ اِس سبب سے ساتویں روز کے ماننے کا حکم کبھی منسوخ نہیں ہوا۔ بلکہ مسیحیوں نے ابتدا سے یعنی مسیح کی قیامت کے دن سے خود بخود سمجھ لیا کہ ہفتہ کا پہلا روز اب خدا کی خاص عبادت کے واسطے اور خصوصاً اُس عبادت کے واسطے جو مسیح نے مقرر کی مخصوص و مقدس ہے دیکھو یوحنا ۲۰: ۲۶ و اعمال ۲۰: ۷ و ۱۔ قرنتیوں ۱۶: ۲ و مکاشفہ ۱: ۱۰ کو +

"اپنے باپ اور اپنی ماں کی عزت کرنا تاکہ" وغیرہ ماں باپ کا ذکر سب سے پہلے اِس لئے ہوا ہے کہ وہ تمام بنی آدم کی نسبت ہم سے زیادہ قریب ہیں اور بعد خدا کے اُن کا حق ہم پر زیادہ ہوتا ہے بلکہ جب تک بچہ بہت چھوٹا رہتا ہے وہ خدا کو پہچان نہیں سکتا۔ اِس واسطے موسیٰ کی شریعت میں والدین کے حقوق پر بڑی تاکید کی گئی اور اُن حقوق کے تارکوں کے لئے سزا کا حکم ہے دیکھو خروج ۲۱: ۱۷ و استثنا ۲۱: ۱۸ تا ۲۱ و ۲۷: ۱۶ و امثال ۳۰: ۱۷ کو + اِس سے صاف معلوم ہے کہ خدا اِس حکم کے عدول کو کیسی نفرت کے ساتھ دیکھتا ہے + لیکن والدین کے حقوق کیا ہیں؟ یہاں صرف عزت کا ذکر ہے۔ اِسواسطے کہ یہ اُن کے باقی سب حقوق کی بنیاد ہے۔ اور جب تک والدین جیتے رہتے ہیں۔ اُن کی عزت کرنی فرض ہے بلکہ کسی حالت میں ان کی ہتک جائز نہیں۔ لیکن جب تک اولاد چھوٹی ہے اُس پر والدین کی عزت کے ساتھ فرمانبرداری بھی کرنی واجب ہے + اِسواسطے رسول افسیوں ۶: ۱ و قلسیوں ۳: ۲۰ میں لکھتا ہے کہ "اے لڑکو خداوند میں اپنے والدین کے فرمانبردار ہو اے لڑکو سب باتوں میں اپنے والدین کی فرمانبرداری کیا کرو" یہہ تو سچ ہے کہ جب تک لڑکا نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اُس وقت تک اُس کے لئے ضرور ہے کہ سب باتوں میں والدین کا حکم مانے لیکن جس قدر وہ خود مختار ہوتا ہے اُسی قدر مناسب ہے

کہ وہ رفتہ رفتہ اپنی تمیز کی پیروی کرے۔ لیکن جب تک والدین زندہ ہیں تمام نیک فرزند چاہیے ہیں کہ ان کی مرضی کے مطابق عمل کریں۔

والدین کے فرائض بھی اس حکم میں اشارۃً مندرج ہیں۔ کیونکہ جو آدمی اپنی اولاد پر بے فائدہ بوجھ ڈالکر اُن سے اپنی بے عزتی کرواتا ہے اُن کے گناہ میں شریک ہوتا ہے۔ اور جو آدمی اپنے لڑکوں کو ایسے حکم دیتا ہے جنہیں وہ نہیں مان سکتے۔ یا جنکا ماننا واجب ہے یا حکم دیکر اُن کی تعمیل سے غافل رہتا ہے یا جب لڑکے بڑے ہو گئے تو بھی انہیں سب باتوں میں اپنے جوئے کے نیچے رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے آدمی کے لڑکے اگر باغی نکلیں تو ان کی بغاوت کا گناہ اس کی اپنی گردن پر ہوگا۔

پھر اس حکم میں نہ صرف والدین کے حقوق مندرج ہیں (ورنہ جن کے ماں باپ مرگئے ہیں۔ اُن سے اس حکم کا کچھ علاقہ نہ ہوگا) بلکہ اُستادوں مالکوں حاکموں اور ان سب کے حقوق بھی جنہیں خدا نے ہمارے اوپر کسی طرح کا اختیار دیا ہے۔ دیکھو خروج ۲۲: ۲۸ و اعمال ۲۳: ۵ و رومیوں ۱۳: ۱ تا ۷ و ۱ تسلونیقیوں ۵: ۱۲ تا ۱۳ طیطس ۳: ۱ تا ۲ و عبرانیوں ۱۳: ۷ و ۱ پطرس ۲: ۱۳ تا ۱۸ کو۔

پانچویں حکم کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ اگر تم اس حکم کو مانوگے۔ اس زمین میں جو خداوند تمہارا خدا تمہیں دیتا ہے تم بہت دن تک جیتے رہوگے۔ اسی جزا کا وعدہ خدا نے بنی اسرائیل سے عہد میں وفادار رہنے کی شرط پر کیا۔ اور اس کے برعکس عام بیوفائی کی یہ سزا مقرر کی کہ تم کنعان کی زمین پر مدت تک قائم نہ رہوگے بلکہ ہلاک کئے جاؤگے۔ دیکھو استثنا ۴: ۲۶ و ۴۰ و ۳۲: ۴۶ و ۲: ۲ : ۲ : ۱۸ کو۔ یاد رکھنا چاہئے کہ بنی اسرائیل کے لئے موسیٰ کی شریعت

میں نیکی اور بدی کی جزا اخروی نہیں بلکہ دُنیوی تھی۔ لیکن یہہ ہمارا حال نہیں ہے۔ خدا اپنے خاص انعام مومنوں کو اس جہان میں نہیں بلکہ اُس جہان میں دیتا ہے اور اس واسطے چاہیے کہ ہم اُس زمین موعودہ کو جو آسمانی کنعان کہلاتی ہے۔ یاد کریں اور اُس کے مشتاق ہو کر (دیکھو عبرانیوں ۹:۳۰ تا ۱۶ کو) خدا کے حکم پر چلنے کی دل و جان سے کوشش کریں + اور چونکہ یہہ جزا جو عام طور پر خدا کی عبادت کی جزا ہے۔ خاص طور پر والدین کی عزت کا بدلہ مقرر ہوئی اس لئے ظاہر ہے کہ خدا اُن کے حقوق کا کیسا لحاظ رکھتا ہے ۰

"تو خون نہ کرنا"

کسی جاندار کی جان بے سبب لینی گناہ ہے۔ کیونکہ سب طرح کی زندگی اُس کا جو الحی کہلاتا ہے خاص انعام ہے۔ دیکھو زبور ۱۰۴: ۲۷ تا ۳۰ و ۱۴۵: ۱۵ تا ۱۶ کو بلکہ جیتی خدا کی مخلوقات میں سے کسی کو بے سبب برباد کرنا گناہ ہے۔ کیونکہ یہہ خالق کی بے ادبی ہے+ لیکن انسان خدا کی صورت پر مخلوق ہوا ہے ہر فرد انسان علاوہ اُس تعلق کے جو وہ باقی بنی آدم سے رکھتا ہے خدا سے بھی خاص علاقہ رکھتا ہے اور اُس کا خاص عکس ہے اور بے انتہا ترقی کی قابلیت رکھتا ہے لیکن ہر فرد حیوان کی نسبت یہہ دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ پس جانور کے مارنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ کیونکہ اُس کی جنس کے اور بہت جانور موجود ہیں۔ لیکن انسان کے مارے جانے سے ایک بے نظیر ہستی دُنیا سے غائب ہوتی ہے+ اسواسطے خدا نے جب طوفان کے بعد انسان کو حیوان کا گوشت کھانے کی اجازت دی۔ تو آدمی کا قتل کرنا تاکیداً منع کیا۔ اور اس ممانعت کا بھی سبب بیان کیا۔ کہ انسان خدا کی صورت پر مخلوق ہوا ہے دیکھو پیدایش ۹: ۳ تا ۶ کو بعض حالتوں میں انسان کا قتل واجب و درست ہے۔ بلکہ خونی کے قتل کا خدا نے خود حکم

دیا ہو ۔ دیکھو پیدائش ۹: ۶ کیونکہ بے ضرورت انسان کے قتل سے سب قومیں طبعاً نہایت پرہیز کرتی ہیں ۔ یوحنا ۸: ۴۴ کے مطابق شیطان پہلا خونی کہلاتا ہے اور پہلا آدمی جو گناہ میں پیدا ہوا اُس نے بھی خون کیا اِس طرح ابتدا ہی سے گناہ نے اپنی حقیقی صورت اور طبیعت ظاہر کی ۔ یوحنا لکھتا ہے کہ صاف ظاہر ہے کہ کسی خونی میں حیات ابدی سکونت نہیں رکھتی (۱ یوحنا ۳: ۱۵)

لیکن اِس حکم میں نہ صرف خون منع ہے بلکہ دل کے وہ حالات بھی جن سے خون صادر ہوتا ہے ۔ یہہ حالتیں دو ہیں یعنی غصہ اور کینہ غصہ سے ناگہانی خون ہوتا ہے ۔ اور کینہ سے وہی فعل عمداً ہوتا ہے ۔ اِس واسطے مسیح نے متی ۵: ۲۱ تا ۲۲ میں غصہ کی سزا خون کی سزا کے برابر ٹھہرائی اور مقدس یوحنا نے اپنے پہلے خط کے ۳: ۱۵ میں لکھا ہے کہ جو کوئی اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہے وہ خونی ہے ۔ کینہ غصہ سے بدتر ہے ۔ کیونکہ اِس میں قصد زیادہ ہوتا ہے اور اِس سبب سے جو خون کینہ سے ہوتا ہے وہ غصہ کے خون کی نسبت زیادہ مکروہ سمجھا گیا ہے ۔ بہر حال یہہ دونوں ایسی باتیں ہیں ۔ کہ اگر اُن کی مزاحمت نکی جائے تو انجام خون ہوتا ہے ۔ پس جو شخص اِن کو اپنے دل میں جگہہ دیتا ہے ۔ چھٹے حکم کو توڑتا ہے ۔

"تو زنا نہ کرنا" شہوت سے جتنے گناہ پیدا ہوتے ہیں ۔ اِس میں زنا سب سے بدتر ہے کیونکہ اُس سے تیسرے آدمی کو ضرر پہنچتا ہے ۔ لیکن زنا میں خاص گناہ یہہ ہے کہ اُس سے انسان اپنے جسم کو بے حرمت کرتا ہے ۔ علاوہ اِس کے زنا چوری میں بھی داخل ہے ۔ پس اِس حکم میں جو فعل منع ہے وہ نہ خدا کا کوئی قصور ہے ۔ نہ دوسرے آدمی کا بلکہ اپنے بدن کی بے حرمتی ہے ۔ لیکن چونکہ ہمارا بدن خدا کی بے مثل صنعت ہے ۔ اِسلئے جو اُس کو خراب کرتا ہے وہ خدا کا بھی گناہگار ہے اور اِس کے علاوہ جب مسیح نے انسانی جسم لیا اور روح القدس ہمارے بیچ میں بسنے لگا اور مسیح

نے ہماری رہائی کے واسطے اپنا بدن قربان کیا اور جس نجات کی اُمید ہم کو انجیل میں دی گئی ہے۔
اس میں نہ صرف روح بلکہ جسم بھی شامل ہے۔ اسلئے مناسب ہے کہ ہم اپنے جسموں کی بڑی حرمت
کریں + دیکھو ۱ قرنتیوں ۶: ۱۳ تا ۲۰ کو + چنانچہ مسیح کی کلیسیا میں جسم کے گناہ زیادہ سمجھے گئے
ہیں۔ جو شخص شہوت میں مبتلا ہو کر نکاح کے پاک عقد کو توڑتا ہے۔ اُس کا گناہ سب سے بڑا ہے۔ لیکن
اس کے سوا ہر قسم کی شہوت پرستی گناہ میں داخل ہے۔ اور نہ فقط ایسا فعل گناہ ہے بلکہ اس کا
خیال بھی منع ہے۔ مسیح نے متی ۵: ۲۷ تا ۲۸ میں کہا ہے + اور سب طرح کا فحش کلام بھی اس حکم
میں منع ہے۔ کیونکہ اُس سے نہ صرف دل میں شہوت پیدا ہوتی اور بڑھتی ہے۔ بلکہ زبان
بھی ناپاک ہوتی ہے۔ دیکھو افسیوں ۴: ۲۹ و ۵: ۱۲ کو بدن کی خاص بے عزتی شہوت پرستی سے
ہوتی ہے + لیکن زیادہ کھانا پینا اور سستی بھی اس گناہ میں داخل ہیں + حاصل کلام جس کام
یا قول یا خیال سے بدن بے عزت ہوتا ہے۔ اُس کو گناہ سمجھنا چاہئے +

ستو چوری کرنا۔ کسی کا حق جبر یا فریب سے لے لینا ہے۔ یعنے جبتک دوسرا آدمی اپنا حق خوشی
سے مجھے نہ دے اور میں کسی طرح سے اُس کو اپنے قبضہ میں لاؤں تو یہہ چوری ہے۔ حق کی تعریف
تو نہایت مشکل ہے۔ اسکی نسبت مختلف ملکوں اور مختلف قوموں میں مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔
غرض یہہ ہے کہ جس چیز میں کوئی شخص اپنا حق سمجھے اور اُس کے ہمسائے اس کی تائید کریں
تو اُس چیز کو بغیر اُس شخص کی اجازت کے لینا چوری ہے۔ لیکن اگر ہمسائے اس امر میں متفق نہیں
تو ملکی عدالت اس کا فیصلہ کرتی ہے + اور ہر شخص کا فرض ہے کہ اُس فیصلہ کو تسلیم کرے۔ اگر ملک
کا قانون اُس امر میں ناقص ہو۔ تو اُس کو بدلنے کی کوشش کرنی جائز ہے۔ لیکن جب تک وہ
قانون بدلا نہیں گیا اس وقت تک اُس کی تابعداری فرض ہے۔ چوری بہت طرح کی ہے۔

کیونکہ جن چیزوں کی چوری ہو سکتی ہے۔ وہ بے شمار ہیں + وہ بادشاہ جو اپنے ہمسایہ کے ملک کو ناحق لیتا ہے چور ہے اور وہ نوکر جو اپنے آقا کے کھانے میں سے کچھ لیتا ہے چور ہے +

"تو اپنے ہمسایہ پر جھوٹی گواہی نہ دینا" جن لوگوں میں چوری بے مزاحمت ہوتی ہے وہ کبھی آسودہ نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح جس قوم میں جھوٹھ زیادہ بولا جاتا ہے۔ وہ ہرگز برقرار نہیں رہ سکتی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بغیر جھوٹھ کے دنیا نہیں چلتی۔ لیکن اس کے برعکس یہہ سچ ہے کہ جھوٹھ کے برابر دنیا کے کام کو روکنے کی اور کوئی شے نہیں اور دنیا کے کاموں کے جاری رہنے کا سبب یہہ ہے۔ کہ سچ جھوٹھ سے کچھ زیادہ ہے + ابتدا سے خدا نے یہہ صاف صاف ظاہر نہیں کیا۔ کہ جھوٹھ بولنا ہر حالت میں گناہ ہے۔ چنانچہ ان دس حکموں میں جھوٹھ کی قطعی ممانعت نہیں ہے۔ صرف جھوٹھی قسم تیسرے حکم میں اور جھوٹھی گواہی نویں میں منع کی گئی ہے + اور جنہوں نے عہدنامہ عتیق کو غور سے پڑھا ہے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ بعض بزرگوں نے جھوٹھ کہے۔ لیکن سزا نہ پائی۔ مثلاً یشوع ۲: ۴ و ۵ و ۶ میں۔ لیکن رفتہ رفتہ خدا نے یہہ زیادہ ظاہر کیا کہ ہر حالت میں جھوٹھ بولنا گناہ ہے اور سچ بولنا فرض ہے۔ مثلاً دیکھو لوقا ۱۰: ۲۶ کو اور نئے عہدنامہ میں سچ بولنا اسلئے فرض ہے کہ سچ اُس نئی پیدائش کا جوہر ہے جو مسیحی کو عنایت ہوتا ہے۔ اور اُس بے ریا محبت کا جو اُس پیدائش کا مظہر ہے + ضروری نتیجہ ہے۔ دیکھو افسیوں ۴: ۲۵ و کلسیوں ۳: ۹ و ۱۰ کو عاقبت میں جو لوگ عبادت ابدی سے محروم ہونگے۔ ان میں جھوٹھے بھی شمار کئے گئے ہیں۔ دیکھو مکاشفہ ۱۴: ۵ و ۲۱: ۸ و ۲۷ و ۲۲: ۱۵ کو + اکثر لوگ کہتے ہیں۔ کہ جس جھوٹھ سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا وہ گناہ نہیں۔ لیکن یہہ محض غلطی ہے۔ گناہ صرف یہی نہیں کہ ہم اپنے ہمسایہ کا نقصان کریں + خدا کا حق اس کو نہ دینا گناہ ہے + خدا برحق ہے اور سب طرح کے جھوٹھ

سے نفرت رکھتا ہی۔ دیکھو استثنا ۲۲:۱۳ و یرمیاہ ۱۰:۱۱ کو +

لیکن ہم ابھی صرف نویں حکم کی تفسیر کرتے ہیں۔ ہمسایہ پر جھوٹھی گواہی نہ صرف کچہری میں بلکہ بہت طرح سے دیجاتی ہے۔ اور یہہ گناہ نہ صرف عمداً ہوتا ہی بلکہ بے سوچے اور غفلت سے بھی ہوتا ہی۔ جب لوگ کسی شخص کی کسی طرح کی بدنامی سنتے ہیں تو اکثر دریافت نہیں کرتے کہ سچ ہی یا نہیں۔ بلکہ فوراً اُس کو پھیلاتے ہیں اور اکثر کچھ نہ کچھ اُس پر بڑھاتے بھی ہیں لیکن اِس کو صرف سنکر دوسروں سے کہنا شروع کیا تو ہم گنہگار ٹھہرے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہی کہ اِس حکم کا عدول کیسا عام ہی +

علاوہ اِس کے یہہ بھی سوچنا چاہیے کہ اِس حکم میں قول کے گناہ صاف صاف منع کئے گئے۔ لیکن اِس ایک حکم سے ظاہر ہی کہ خدا قول کے گناہوں سے بھی نفرت رکھتا ہی + جو لوگ کہتے ہیں (زبور ۱۲:۴) کہ ہمارے لب ہمارے ہی ہیں وہ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ مسیح نے متی ۱۲:۳۴ تا ۳۷ میں صاف صاف کہا ہی۔ کہ ممکن ہی کہ قولی گناہ سب گناہوں سے بڑا ہو۔ اور ایسے گناہ کی سزا بہت بھاری ہوگی +

"تو اپنے ہمسایہ کے گھر کا لالچ نکرنا تو نہ اپنے ہمسایہ کی جورو کا نہ اُس کے غلام کا۔ نہ اُس کی بندی کا نہ اُس کے بیل کا۔ نہ اُس کے گدھے کا لالچ کرنا" جیسا نویں حکم میں قول کے گناہ منع کئے گئے اسی طرح سے اِس دسویں حکم میں خیال کے گناہ ممنوع ہوئے + اِس طرح سے خدا نے ظاہر کیا۔ کہ میں دلکا دیکھنے والا اور خیالوں کا جانچنے والا ہوں دیکھو اشموئیل ۱۶:۷ و ۱۔ تواریخ ۲۹:۱۷ زبور ۱۳۹:۱ تا ۵ یرمیاہ ۱۷:۹ و ۱۰ کو + کوئی فعل ظاہرا کیسا ہی خوب کیوں نہ معلوم ہو تو بھی اگر دل کے صحیح حال سے نہ نکلا ہو۔ تو وہ خدا کا مقبول

نہیں - جو لوگ اپنے دلوں کو اپنے اختیار میں سمجھکر طرح طرح کے خیالوں کو ان میں جگہہ دیتے ہیں -
وہ خدا کے منکروں سے کم نہیں دیکھو مزمور ۶۶ : ۱۸ و ۳۶ : ۱ تا ۵ - یہہ حکم آٹھویں حکم سے
یہہ خاص علاقہ رکھتا ہے - کہ آٹھویں حکم میں ہمسایہ کے مال کا لے لینا منع ہوا ہے اور انہیں
اُس کی خواہش بھی ممنوع ہے - اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ باقی حکموں کے توڑنیکی خواہش
بھی گناہ ہے -

غلام اور لونڈیاں اور بیل اور گدھے اُس زمانہ میں بنی اسرائیل کا خاص مال
تھے اس سبب سے انکا خاص ذکر یہاں ہوا ہے - لیکن وہ صرف مثال کے طور پر مذکور ہیں
اور اس حکم میں ہر قسم کا مال داخل ہے -

۳ - سوال و جواب میں دس حکموں کی تفسیر ہوئی ہے - اب ہم اُس کی طرف توجہ کرتے
ہیں - دس حکموں میں سے پہلے چار میں خدا کے حقوق مندرج ہیں اور آخری چھ میں انسان
کے حقوق لیکن ان میں اپنے بدن کے فرائض بھی شامل ہیں جیسے کہ چھٹے ساتویں حکم کی تفسیر
میں کہا ہے یقین تو نہیں - لیکن غالباً خدا نے دس حکموں کو خود اسطرح تقسیم کیا اور ان دو
حصوں کو دو مختلف لوحوں پر لکھوایا اس سبب سے یہہ حکم اکثر پہلی یا دوسری لوح کے حکم
کہلاتے ہیں - مسیح نے دو حکموں میں دس حکموں کا خلاصہ بیان کیا ہے -

پہلی لوح کا خلاصہ تو استثنا ۶ : ۵ میں پایا جاتا ہے - یعنی تمام دل سے خدا سے محبت
رکھنا صاف ظاہر ہے کہ سب احکام اور فرائض کی بنیاد یہی ہے - اسواسطے مسیح نے مرقس
۱۲ : ۲۹ تا ۳۰ میں اس کو سب احکام میں پہلا ٹھہرایا ہے اور اُس حکم سے پہلے جو موسیٰ نے
کہا - کہ خداوند واحد ہے - وہ اُس کی بنیاد ہے - کیونکہ جب خدا واحد ہے - تو اپنے دل کو کسی

طرف مائل کرنا فرض ٹھہرا (دیکھو مزمور ۸۶: ۱۱ کو) اور پھر جب خدا واحد ہے تو اُس کے کسی حکم کو توڑنا خواہ وہ حکم پہلی لوح کا ہو خواہ دوسری کا گناہ ہے - دیکھو یعقوب ۲: ۱۰ تا ۱۱ کو + دوسری لوح کے احکام کا خلاصہ احبار ۱۹: ۱۸ میں ہے - یعنی یہہ کہ ہمسائے سے اپنے برابر محبت رکھنا - اِس حکم کو مسیح نے پہلے کی مانند کہا ہے - دیکھو متی ۲۲: ۳۹ کو وہ اُس کو دوسرے کے برابر نہیں کہتا کیونکہ خدا ہمارے ہمسایہ کے برابر نہیں ہو سکتا + اِس حکم کو مقدس یعقوب نے (۲: ۸ میں) شاہی شریعت کہا ہے نہ صرف اسواسطے کہ وہ دیگر احکام سے افضل ہے بلکہ اسواسطے بھی کہ جو اُس کی حفاظت کرتے ہیں وہ شاہی درجہ کے لائق ہوتے ہیں - (مکاشفہ ۱: ۶ کو دیکھو) محبت کا حکم غلامی کے مزاج سے مانا نہیں جا سکتا - بلکہ شاہی مزاج سے اُس کی حفاظت ہو سکتی ہے - جس حکم کو مسیح نے متی ۷: ۱۲ میں شریعت اور انبیا کے صحایف کا خلاصہ کہا ہے - (جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تم سے کریں - تم بھی اُن سے ویسا ہی کرو -) وہ کوئی دوسرا حکم نہیں - بلکہ ہمسایہ سے محبت رکھنے کے حکم کا ایک نمونہ ہے - یعنی اگر ہم دریافت کرنا چاہیں کہ آیا ہم فلاں آدمی سے اپنے برابر محبت رکھتے ہیں یا نہیں تو اپنے دل سے یہہ پوچھیں کہ آیا جیسا ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہم سے سلوک کرے ویسا ہی سلوک ہم اُس سے کرتے ہیں یا نہیں ممکن ہے کہ کوئی اِس حکم کو بھی صرف لفظی طور پر مانے - کہ محبت کے حکم کو فی الحقیقت توڑے - محبت صرف یہہ نہیں کہ ہم ہر شخص کے ساتھ اُس کی مرضی کے مطابق برتاؤ کریں - کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایسی بات چاہے جو اُس کے لئے مضر ہو - محبت ہر وقت بہتری اور ترقی کی جویاں رہتی ہے اور اگر ساتھ ہی محبوب کو خوش کر سکے تو کوشش میں کمی نہیں کرتی +

پہلی اور دوسری لوحوں کے احکام کی جو تفسیر سوال و جواب میں ہوئی ہے اُسکا سمجھنا آسان

ہی صرف ایک بات باقی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی گناہ سے چھوٹنا چاہئے۔ تو اسکے لئے صرف اتنا کافی نہیں کہ اس گناہ سے بچنے کی کوشش کرے بلکہ ساتھ اس کوشش کے اُسکو یہہ بھی مناسب ہے کہ جو نیکی اُس گناہ کی خاص مخالف ہے اُسکے حاصل کرنے میں بھی حتی المقدور محنت کرے چنانچہ جب مقدس پال نے افسیوں ۴: ۲۸ میں چور کو حکم دیا کہ پھر چوری نکرے تو فوراً اُسکو یہہ نصیحت بھی دی کہ محنت کر اور اپنے ہاتھوں سے اتنا کما کہ تو کسی محتاج کو بھی کچھ دیسکے۔ اسی طرح دوسری لوح کے احکام کی تعمیر میں اس حکم پر کفایت نہیں کہ پرائے مال کا لالچ مت کرو۔ بلکہ یہہ نصیحت بھی بڑہائی گئی کہ اپنا روزینہ آپ کماؤ اور دنیا کی جس حالت میں خدا تم کو رکھے اُس میں اپنے فرائض ادا کرو کیونکہ جو ایسا کرتا ہے اُس کے دل میں پرائے مال کا لالچ کس طرح آئیگا؟ لالچ دو سببوں سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یا تو کوئی شخص سُستی کر کے کچھ کماتا نہیں یا کم کماتا ہے۔ اور اسواسطے زیادہ کمانیوالوں کے مال کا لالچ کرتا ہے۔ یا کماتا تو ہے۔ لیکن اور لوگوں کے برابر پسندیدہ خوراک نہیں پاتا اور نہ اُن کے برابر آرام سے رہ سکتا ہے۔ پس اپنی سوکھی روٹی اور کم آرام کی حالت پر کفایت نکر کے۔ ان کے زیادہ مال کا لالچ کرتا ہے۔ لیکن یہہ محض بے وقوفی ہے اور دینداری کے بالکل برخلاف۔ دیکھو تمتاؤس ۶: ۸ تا ۱۰۔ اور دنیا کے جس حال کو خدا ہمارے لئے مُفید جانتا ہے اُس میں ہم کو رکھتا ہے۔ جو کوئی اُس میں شک کرے وہ دیندار نہیں ہو سکتا۔

سبق (۴) دُعا کے باب میں؛

اس سبق میں تین باتوں کا بیان ہے۔ ایک یہہ کہ خدا کے احکام کی حفاظت اس کے خاص فضل کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسری یہہ کہ یہہ خاص فضل دعا مانگنے سے حاصل ہوتا ہے۔

تیسری یہہ کہ سب دعاؤں میں سے وہ دعا جو خداوند کی کہلاتی ہے۔ افضل ہے +

۱ پہلی بات یہہ ہے کہ اگرچہ خدانے مذکورۂ بالا سب احکام ہمکو دیے ہیں اور اُن کی تعمیل ہمپر نہایت ہی فرض ہے۔ تو بھی ہم اپنی طاقت سے اُن کی تعمیل نہیں کر سکتے۔ اس کے تین خاص سبب ہیں + ایک یہہ کہ ہم پیدایش ہی سے بہ نسبت نیکی کے بدی کی طرف زیادہ میلان رکھتے ہیں + خدانے انسان کو نیکی کی طرف میلان بخشتا ہے۔ لیکن جب آدم وحوا نے گناہ کیا۔ اُسی وقت سے اِنسانیت بدی کی طرف زیادہ مائل ہوگئی + اور یہہ بُرا میلان اُن دو شخصوں پر ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اُن کی اولاد میں بھی پھیل گیا۔ یہاں تک کہ آدم کی نسل میں جتنے (معمولی طور پر بغیر معجزہ کے) پیدا ہوئے سب کے سب اُس کو اپنے ساتھ دنیا میں لائے ہیں + یہہ حال عقلمندوں پر صاف ظاہر ہے + سب کو معلوم ہے کہ نیکی بغیر کوشش و محنت و نفس کشی کے نہیں ہوتی لیکن بدی میں کوشش درکار نہیں + تمام تواریخ کے دیکھنے سے معلوم و ثابت ہے کہ جتنی اصلاحیں بنی آدم میں ہوئیں۔ اُنکا نیک نتیجہ صرف چند روز قایم رہا دنیاوی علم و ہنر و تہذیب وغیرہ میں جو ترقی ہوئی اس کا حاصل اکثر باقی رہا ہے۔ لیکن جب کبھی خدانے کسی نبی کو بھیجکر لوگوں کو اس کی معرفت بدی اور جہالت اور بت پرستی سے پھیر کر اپنی طرف رجوع کیا۔ تو دیکھا گیا ہے کہ اُس کے بعد پھر فساد نے جلد سر اُٹھایا اور تھوڑے عرصہ میں ایسا غالب ہوگیا۔ کہ نئی اصلاح کی ضرورت ہوئی + پھر سب پر آشکارا ہے کہ والدین کا مزاج اولاد میں ہمیشہ کم و بیش ظاہر رہتا ہے + بعض گناہ ایسے ہیں کہ اگر وہ والدین میں پائے جائیں تو اولاد میں بھی اُن کی طرف میلان ظاہر ہوتا ہے + پس اِس میں تعجب نہیں کہ گناہ کی طرف میلان ہمارے اصلی والدین سے ہم تک چلا آیا ہے یہہ مسئلہ رومیوں ۵: ۱۲ و افسیوں ۲: ۳

ومزمور ۵۱: ۵ میں صاف صاف مذکور ہوا ہی +

دوسرا سبب یہہ ہی کہ ہم میں بُری عادتیں پیدا ہو چکی ہیں اُس بدمیلان کے سوا جو والدین سے ہمکو ملا - ہم نے خود ایک اور بدمیلان اپنے افعال کے وسیلہ سے پیدا کیا ہی + کیونکہ جب کسی سے کوئی فعل ہوا تو فوراً اُس قسم کا فعل پہلے کی نسبت اُس کے واسطے ذرہ آسان ہو جاتا ہی - اور اُس فعل کی عادت ہوتی جاتی ہی + عادت کا چھوڑنا اور طبعی میلان کی ممانعت مشکل ہی - لیکن جب کوئی عادت مدت تک کسی پر غالب رہی ہو - تو اُس کے بند ایسے مضبوط ہو جاتے ہیں کہ انہیں توڑنا بہت مشکل ہوتا ہی - اور بُری عادت کا میلان ساتھ اُس بدمیلان کے جو پیدایش سے ہی - ملکر نہایت مضبوط ہو جاتا ہی یہانتک کہ انسانی قدرت سے اُس کے بند ہرگز ٹوٹ نہیں سکتے + انسان کی بڑی کمبختی یہہ ہی - کہ اگرچہ وہ بذاتہ نیکی کی قابلیت رکھتا ہی تاہم بدی سے گریز میں ایک قدم بھی از خود نہیں اُٹھا سکتا جیسا کوئی آدمی جو کوئیں میں گر پڑا ہو نیچے سے آسمان کو دیکھے - اور اوپر کی روشنی کو اپنے چاروں طرف کی تاریکی سے زیادہ پسند کرے اور باہر نکلنے کا بڑا خواہشمند ہو - ظاہر ہی کہ وہ شخص بغیر کسی دوسرے کی مدد کے کبھی باہر نہ نکل سکیگا - اسی طرح بنی آدم گناہ اور کمزوری سے بغیر خدا کے فضل اور مدد کے ہرگز نکل نہیں سکتے +

لیکن اِن کے سوا ایک اور بھی سبب ہی - انسان نہ صرف از خود کمزور ہی - بلکہ جانی دشمنوں سے گھرا ہوا ہی + نہ صرف اُسکی اپنی بگڑی ہوئی طبیعت ساتھ اُس بُرے میلان کے جو اُس نے اپنے والدین سے پایا ہی اُس کی ترقی کو روکتی ہی - بلکہ شیطانی ارواح شب و روز اُس کی مزاحمت و مخالفت پر آمادہ ہیں + کبھی وہ اُس کو پھسلاتے اور کبھی ڈراتے ہیں - اور اُنکا دائمی مطلب فقط

یہی رہتاہے۔ کہ ہم کو خدا کی راہ پر چلنے نہ دیں بلکہ اُس کے حکموں سے ہٹاکر ہم کو گناہگار بناکے اور ہلاک کریں۔ یہہ مسئلہ افسیوں ۲:۲ و ۶ : ۱۲ اور اور بہت مقاموں میں صاف مذکور ہے۔ اور ان شریر ارواح کے بادشاہ کا نام شیطان ہے + اُس کا مقابلہ بنی آدم کے لئے نہایت مشکل ہے اور بغیر خدا کے کامیابی محال ہے +

یہہ خاص فضل کیا شے ہے؟ اُس کا عام فضل و رحم تو ہر دم اور ہر جگہہ موجود اور موثر ہے جیسا مزمور ۱۴۵ : ۹ میں ذکر ہے بنی آدم میں جتنی نیکی ہے۔ وہ سب خدا کے فضل سے ہے + بیدینوں کی دانائی میں جتنی سچائی ہے۔ وہ بھی اُس کے اثر سے ہے۔ لیکن یہہ عام فضل انسان کی ناچاری کے علاج کو کافی نہیں۔ ورنہ تمام بنی آدم کی روحانی حالت ایک ہی درجہ کی ہوتی ہے + انسان کو اُس گڑھے میں سے جس میں وہ پڑا ہے نکالنے اور نیکی کی راہ پر چلانے کے لئے خدا کا خاص فضل درکار ہے۔ یہہ فضل تین درجوں کا ہے اور جب تک یہہ تینوں درجے کسی شخص کو حاصل نہوں وہ خدا کے حکموں کی تعمیل نہیں کرسکتا + فضل کا پہلا درجہ یہہ ہے۔ کہ خدا نے مسیح کو دنیا میں بھیجا تاکہ ہمارے لئے کفارہ ہو اور اُس کو مُردوں میں سے اُٹھاکر آسمان پر بلند کیا اور روح القدس کو اُس کا نایب بناکر کلیسیا کو دُنیا میں قایم کیا اور اس طرح تمام دنیا کی نجات کا انتظام کیا۔ (دیکھو یوحنا ۳ : ۱۶) اور دوسرا درجہ یہہ ہے کہ خدا نے ان سب باتوں کا علم ہم تک پہنچادیا اور ہم کو اپنی کلیسیا میں شریک کیا ہے + ہم نہیں کہہ سکتے کہ خدا کیوں کسی کو ایسا فضل بخشتا ہے اور کسی کو اُس سے محروم چھوڑتا ہے یہہ خدا کی حکمت کا راز ہے + دیکھو رومیوں ۹ : ۱۶ تا ۱۴ و ۳۳ تا ۳۶ کو ہمیں اُس کی شکرگذاری کرنی چاہیے؟ اِس واسطے کہ اُس نے یہہ خاص فضل ہم پر کیا ہے۔ لیکن بعض لوگ مسیح کی انجیل کو سُنتے اور سمجھتے ہیں۔ اور اُس کی کلیسیا میں

شریک بھی ہوتے ہیں۔ لیکن خدا کی راہ پر نہیں چلتے۔ اس کا کیا سبب ہے؟ یہہ کہنا کافی نہیں کہ وہ خدا کی راہ پر چلنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ انسان کی بدحالی ایسی ہے کہ اگرچہ وہ دین حق کو جانتا ہے۔ تو بھی از خود اس پر چل نہیں سکتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فضل کا تیسرا درجہ بھی ہے۔ جس سے انسان خدا کی طرف سے استقلال کی نعمت حاصل کرتا ہے اور سیدھی چال چل سکتا ہے +

ہم نہیں کہتے کہ اس فضل کو پاکر انسان آزاد نہیں رہتا اور مجبوراً نیکی کرنے لگتا ہے۔ اس مسئلہ میں ایک راز ہے جو ہمارے فہم سے باہر ہے۔ تو بھی یہہ تسلیم کرنا لازم ہے۔ کہ جو خدا کی راہ پر چلتے ہیں۔ اُن کو خدا کی طرف سے ایسی مدد ملتی ہے۔ جیسی اوروں کو نہیں ملتی + ہر سچّا دیندار مسیحی یہہ اقرار کریگا۔ کہ اگر خدا کا خاص فضل مجھ پر نہوتا تو میں باوجود اپنی خود مختاری کے بدی سے ہرگز چھوٹ نہ سکتا + یہہ مسئلہ رسولوں کے تمام صحائف میں ایسا صاف ظاہر ہے۔ کہ مثالوں کی ضرورت نہیں +

۲۔ دوسری بات یہہ ہے۔ کہ جس خاص فضل کے بغیر ہم خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کر سکتے وہ ہمکو دُعا کے وسیلے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہہ مطلب نہیں کہ خدا بغیر ہماری دُعا کے اپنا خاص فضل نہیں دے سکتا بلکہ مانگنے کی خواہش بھی بغیر اُس کے فضل کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ جیسا فلپیوں ۲: ۱۳ سے ظاہر ہے + خدا نے دُعا فضل کی شرط ٹھہرائی ہے۔ اور اگر ہم دُعا نہ مانگیں تو اُس فضل کی اُمید رکھنے کا ہمیں کچھ حق نہیں + دُعا کے ذریعہ سے خدا نے اپنے اور ہمارے درمیان جو علاقہ باندھا ہے۔ اس میں بڑا بھید ہے۔ جو ہمارے فہم میں نہیں سماتا۔ لیکن اُس کے کلام مقدس کی ہدایت ہے کہ باوجود تمام عقلی مشکلات کے ہم اپنی عرضیں خدا کے حضور میں پیش کیا کریں + دیکھو مزمور ۵۰: ۱۵ و یرمیاہ ۳۳: ۳ و متی ۷: ۷ تا ۸ و مرقس ۱۱: ۲۴ و لوقا ۱۱: ۵ تا ۱۳ و یوحنا ۱۴: ۱۳ تا ۱۴ و ۱۵: ۷ و ۱۶: ۲۳ تا ۲۴

لیکن اِس امر میں دو طرح کی غلطیوں سے بچنا چاہیے ایک یہہ کہ دعا کوئی ثواب کا کام نہیں جس کے
بدلے ہم خدا سے برکت کی اُمید کریں۔ اگر کوئی لڑکا اپنے باپ سے روٹی مانگے تو کون کہیگا کہ لڑکے
نے ثواب کمایا ہے + دوسری غلطی یہہ ہے کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ دعا مانگنے سے ہم نے خدا کو اپنا
مطیع کر لیا ہے + ایسا خیال صرف مشرکوں کے لایق ہے۔ کیونکہ جو اِنسان کا مطیع ہو جائے
وہ قادر مطلق نہیں ہو سکتا۔ خدا ہماری دعاؤں سے خوش ہو کر جو کچھ ہمارے لئے بہتر سمجھتا ہے
ہم کو دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض وہ چیزیں جو ہم اُس سے مانگتے ہیں وہ ہمیں نہ دے۔ لیکن روحانی برکات
کے پانے میں کچھ شک نہیں ہو سکتا + اِس لئے ہم کو مناسب ہے کہ ایمان کے ساتھ اُس سے فضل
مانگیں۔ اور جو مسیح میں ہو کر دعا مانگتے ہیں وہ ایسی چیزیں مانگتے ہیں۔ جو اُس کے لایق اور اُس
کو پسند ہیں پس خدا کے فضل کے برابر کونسی چیز مسیح کے لایق اور اُس کی مرضی کے مطابق ہو
سکتی ہے؟ اِس لئے سارے دل و جان سے خدا کا فضل حاصل کرنے کی کوشش کیا چاہیے ٭

۳۔ جو دعا مسیح کے نام پر دل سے مانگی جائے خدا اُس کو سنتا ہے۔ لیکن سب سے
افضل وہ دعا ہے جو خداوند کی دعا کہلاتی ہے۔ جو خداوند یسوع مسیح نے اپنے شاگردوں کو سکھائی
اِس دعا کی کچھ تفسیر سوال و جواب میں ہوئی ہے۔ مناسب ہے کہ یہاں اُس کا کچھ بیان کیا
جائے ٭

اِس تفسیر میں خدا کی مہربانی اور اُس کے فضل کا فرق بیان ہوا ہے۔ خدا بنی آدم
کا باپ ہے۔ اور تمام جسمانی اور روحانی برکات اُسی سے نکلتی ہیں۔ اُس کی مہر تمام مخلوقات
پر ہے۔ لیکن بنی آدم کو جن خاص برکات کی ضرورت ہے اُن کے دینے میں بھی خدا بڑا کریم ہے۔
پھر وہ "ہمارا باپ" کہلاتا ہے۔ اِس ہمارے سے ظاہر ہے کہ اُس کی محبت تمام بنی آدم پر یکساں

ہے - اور اسلئے ہم اِس دُعا میں تمام بنی آدم کیواسطے عرض کرتے ہیں - یہہ بات اِس دُعا کی پہلی تین
درخواستوں سے بھی ظاہر ہے کیونکہ اگر خدا کا نام مقدس کیا جائے اور اُسکی سلطنت آئے اور اُسکی مرضی بھی
پوری ہو - تو یقین ہے کہ تمام بنی آدم کی روحانی بہتری ہوگی - اور جیسا یہاں ذکر ہے اُس کی
عبادت و بندگی و فرمانبرداری بجالایا کرینگے جیسا اُنپر واجب ہے - پھر مسیح نے ہمیں سکھایا ہے
کہ اپنی روزمرہ کی روٹی اپنے آسمانی باپ سے مانگیں یقین ہے کہ اس میں جسمانی اور روحانی دونوں
طرح کی خوراک شامل ہے یعنی جو کچھ ہماری روحوں اور بدنوں کیواسطے ضرور ہے + پھر یہہ بھی
ظاہر ہے - کہ مسیح نے ہم کو سکھلایا ہے کہ اپنے آسمانی باپ سے گناہوں کی مغفرت چاہیں -
اور ہماری یہہ عرض ہے کہ وہ سب روحانی و جسمانی خطروں میں حمایت کرے - اور تمام گناہ
اور شرارت سے ہمارے روحانی دشمن یعنی شیطان سے اور موت ابدی سے ہمیں بچائے -
اور یہہ سب خداوند کی دُعا کی آخری دو درخواستوں کی تفسیر ہے - اور اِس دعا کے بعد جو
فقرہ اکثر پڑہا جاتا ہے یعنی یہہ کہ "کیونکہ سلطنت و قدرت و جلال ابدالآباد تیرا ہی ہے" اگرچہ
خداوند کی دعا کا حصہ نہیں - تو بھی اُس سے اُس دُعا کے مقبول ہونیکا بڑا یقین پیدا
ہوتا ہے - چنانچہ اِس تفسیر میں بھی یہہ لکھا ہے کہ مجھے بھروسا ہے - کہ وہ اپنی رحمت و مہربانی
سے ہمارے خداوند یسوع مسیح کے طفیل سے ایسا ہی کریگا - اس کے بعد جو آخری لفظ یعنی
"آمین" پڑہا جاتا ہے - یہہ بھی اگرچہ اِس دعا کے اصل میں نہیں ہے - تو بھی اِس جگہہ میں نہایت
بجا ہے - لفظ آمین عبرانی ہے اور اُس کے معنے "سچ" ہیں - پس جب ہم اپنی دُعاؤں کے
آخر میں آمین کہتے ہیں تو مطلب یہہ ہے کہ جو کچھ ہمنے ابھی اپنے لبوں سے کہا ہے - یا خادم دین
نے ہمارا امام ہوکر کہا ہے - وہ سچ مچ ہمارے دلوں کا مطلب بھی ہے اور ہماری طرف سے کہا گیا ہے

سبق (۵) سکرامنٹوں کے بیان میں

ان کے بارہ میں اس رسالہ میں بہت کچھ نہیں لکھا جائیگا۔ کیونکہ بپتسمہ کی نسبت عنقریب جتنا لکھنا ضرور تھا۔ وہ اسکے پہلے سبق میں مذکور ہو چکا ہی اور عشاے ربانی کی نسبت جو کچھ راقم لکھ سکتا ہی۔ اسکی اکثر باتیں وہ اُس رسالہ میں لکھ چکا ہی۔ جو اُس سکرامینٹ کے نام پر شایع ہوا ہی + پس سوال و جواب میں سکرامینٹوں کا جو بیان ہوا ہی اُس کی تفسیر کے سوا اس مقام میں ہم زیادہ نہیں لکھتے +

۱۔ جاننا چاہیے کہ لفظ سکرامینٹ لاطینی ہی اور اُس کے لغوی معنوں کے مطابق اصلی معنے مقدس رسم کے ہیں۔ دعا وعظ نماز خدا کے کلام کا پڑھنا اور اور بہت سے کام سکرامینٹ کہلا سکتے ہیں۔ اور کلیسیا کے پہلے زمانہ میں یہی دستور رہا۔ ان سب پاک رسموں میں سے رفتہ رفتہ خاص سات رسوم رومی کلیسیا میں اس نام سے مشہور ہوئے اور آجکل صرف وہی سات اس نام سے کہلاتی ہیں یعنی بپتسمہ استحکام۔ عشاے ربانی توبہ (جس میں گناہوں کا خادم دین کے سامنے اقرار کرنا اور اُس کے منہہ سے مغفرت کا کلمہ سننا شامل ہی) نکاح تقرر آخری مسیح لیکن سولھویں صدی میں جب کلیسیا کی اصلاح ہوئی تو مصلحوں نے دیکھا کہ یہہ سات رسوم ایک درجہ کے نہیں اور اسواسطے ان سب کو ایک ہی نام سے کہنا درست نہیں۔ نکاح اور تقرر میں سب مسیحی شریک نہیں ہوتے اور گناہوں کا آدمی کے سامنے اقرار کرنا سوا اُن آدمیوں کے جن کے قصور ہمنے کئے ہوں) اور اُس سے مغفرت کا کلمہ سننا خدا کا کوئی حکم نہیں اور آخری مسیح اگرچہ ظاہراً یعقوب ۵: ۱۴ء ۱۵

سے ملتا ہے۔ تو بھی اُس سے بہت متفرق ہے۔ کیونکہ وہ دستور جسمانی صحت کا وسیلہ تھا لیکن
یہہ عین مرتے دم کیا جاتا ہے۔ اور یہہ استحکام اگرچہ رسولوں سے مقرر ہوا اور سب مسیحیوں
کے واسطے ہے۔ تو بھی چونکہ مسیح نے خود اُس کو نہیں مقرر کیا۔ اِس لیے ہم سب کے واسطے
ایسا ضروری نہیں کہہ سکتے کہ اُس کے ترک کرنے والوں کو مذہب سے خارج سمجھیں صرف دو رسوم
ہیں یعنی بپتسمہ اور عشائے ربانی جن کو ہماری کلیسیا سکرامنٹ کہتی ہے۔ یہہ دو عموماً نجات کے
واسطے ضروری سمجھے گئے ہیں۔ جس شخص کو یہہ دو سکرامنٹ یا اُن میں سے ایک دستیاب
نہو سکے اُس پر کوئی الزام نہیں آتا۔ لیکن یہہ بات سب بغیر ممکن فرائض پر صادق آتی ہے۔ اگر
کوئی شخص بارادۂ اِن رسوم سے بے پروائی کرے تو کبھی نجات کا مستحق نہ سمجھا جائیگا +

۲۔ جس معنے میں انگریزی کلیسیا لفظ سکرامنٹ کو سمجھتی۔ اُس معنے کے مطابق اُس
کی تعریف یہاں لکھی گئی ہے۔ پہلے وہ ایک ظاہری اور مرئی شے ہے۔ دوسری یہہ ظاہری اور
مرئی شے ایک اور شے کی جو باطنی اور غیر مرئی یعنی روحانی ہے علامت ہے۔ تیسرے یہہ باطنی اور
روحانی شے خدا کا فضل یعنی (لفظ فضل کے اِس معنے کے موافق جو صرف مسیحیوں میں پائے
جاتے ہیں جیسے پچھلے سبق میں ذکر ہوا) کوئی خاص باطنی قوت ہے جو خدا ہمارے دلوں میں دیتا
ہے چوتھے یہہ ظاہری اور مرئی رسم خود مسیح سے مقرر ہوئی جیسے اوپر ذکر ہوا۔ پانچویں وہ محض
علامت نہیں بلکہ وسیلہ بھی ہے یعنی اس کے وسیلہ سے وہ باطنی نعمت نہ صرف معلوم ہوتی
اور یاد آتی ہے۔ بلکہ حاصل بھی ہوتی ہے جس وقت کوئی بپتسمہ یا عشائے ربانی کو لیتا ہے اُسی
وقت اور اُس کے ساتھ ہی اور اُس کے وسیلہ سے وہ اپنے باطن میں خدا کی خاص نعمت بھی
پاتا ہے۔ لیکن اُس کا یہہ مطلب نہیں کہ یہہ نعمت اُس وقت دل میں محسوس ہوتی ہے ممکن تو ہے کہ

وہ فضل محسوس ہو اور پھر ممکن ہی کہ نہ ہو بہرکیف مناسب ہی کہ ہم شک نہ لائیں بلکہ کامل اعتقاد رکھیں۔ کہ وہ نعمت ہمکو فی الحقیقت حاصل ہوئی ہی اور اس اعتقاد کے زور سے نیک اعمال میں ترقی کریں +

۳۔ لفظ سکرامینٹ کے مرقومہ بالا تعریف کے ذریعہ بر خلاف لب ظاہری علامت اور باطنی فضل کا ذکر کیا جاتا ہی۔ لیکن یہہ کوئی بڑا فرق نہیں۔ لفظ سکرامینٹ کبھی ایسا مستعمل ہوتا ہی۔ کہ اُس سے صرف ظاہری علامت مراد ہوتی ہی اور کبھی ایسا کہ باطنی فضل بھی اس میں مشتمل ہوتا ہی +

۴۔ بپتسمہ کا جو ظاہری جزو ہی اسمیں دو اشیا شامل ہیں۔ ایک پانی ہی جو ہر جگہہ مل سکتا ہی اور ہر ملک اور ہر زمانہ میں چیزوں کے دھونے اور صاف کرنیکا خاص وسیلہ ہی دوسری شی وہ کلمہ ہی۔ جو خود مسیح نے مقرر کیا۔ کہ باپ اور بیٹا اور روح القدس کے نام میں بپتسمہ دیا جائے۔ دیکھو متی ۲۸: ۱۹ کو۔ اس کلمہ کا مطلب یہہ نہیں کہ باپ اور بیٹا اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دیا جائے جیسا کوئی اور کام خدا کے نام سے یا کسی آدمی کے نام سے بھی کیا جا سکتا ہی۔ بلکہ یہہ کہ بپتسمہ کے وسیلہ سے آدمی باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام میں شامل یا داخل کیا جائے۔ اور چونکہ خدا کے نام سے مراد خدا کی ذات ہی۔ اس واسطے اُس کے نام میں داخل کیا جانا خود اُسی میں۔ جس نے رحم کرکے اپنے آپ کو کسی قدر ہمپر منکشف کیا ہی۔ داخل کیا جانا ہی پھر چونکہ باپ بیٹے اور روح القدس کے لئے لفظ نام صیغہ واحد میں آیا ہی۔ اس سے ظاہر ہی کہ تینوں کی ذات ایک ہی ہی۔ پس بپتسمہ گویا علامت کی رسم ہی کہ اُس کے وسیلہ سے ہم مقدس ثالوث میں داخل کئے جاتے ہیں: پانی کی نسبت ہمکو یہہ بھی کہنا چاہئے

کہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ بغیر غوطہ کے حقیقی بپتسمہ نہیں ہوتا۔ وہ باطل گمان ہے۔ اسکی بطالت
کی ایک دلیل یہہ ہے۔ کہ زمین پر بہت ایسے مقام ہیں جہاں آدمی بکثرت بستے ہیں۔ لیکن پھر
بھی پانی ایسی کمی سے ملتا ہے۔ کہ اُس میں غوطہ لگانا مشکل ہے۔ بلکہ بعض جگہ بھی اُس سے بڑا نقصان
ہوتا ہے چنانچہ آج کل یروشلم میں اگرچہ پینے اور پکانے کو پانی ملتا ہے۔ تو بھی اُس کے باشندے
اکثر غسل نہیں کرتے۔ پس تین ہزار آدمی ایک دن میں کیونکر غوطہ پا سکے ہونگے ؟ (دیکھو اعمال
۲: ۴۱ کو) اور پھر جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ لفظ بپتسمہ یونانی میں صرف غوطہ کے معنوں میں پایا
جاتا ہے۔ یہہ دعویٰ بھی غلط ہے اور پھر جیسا بپتسمہ کے باطنی جزو کو کئی مقاموں میں (مثلاً
رومیوں ۶: ۴ قلسیوں ۲: ۱۲ میں) دفن سے تشبیہہ دیجاتی ہے جس سے وہ لوگ یہہ نتیجہ نکالتے
ہیں کہ بپتسمہ غوطہ ہی سے ہو سکتا ہے اُسی طرح اور چند مقاموں میں اس کو بارش سے تشبیہہ
دی گئی ہے۔ مثلاً یسعیاہ ۴۴: ۳ و ۵۔ یوئیل ۲: ۲۸ تا ۲۹ میں و ۱۔ قرنتیوں ۱۰: ۲ میں یہہ ذکر
ہے۔ کہ بنی اسرائیل نے بادل اور سمندر میں بپتسمہ پایا سمندر میں سے تو وہ گذرے
لیکن بادل صرف اوپر سے اُن پر آیا ؛

بپتسمہ میں جو باطنی اور روحانی نعمت دیجاتی ہے۔ اسمیں گذشتہ زمانہ کی نسبت موت اور آیندہ
کی نسبت نئی پیدایش شامل ہیں (دو حصہ ہوتا ہیں) کہ ہر انسان کیلئے نئی پیدایش بپتسمہ سے ملتی ہے
کیونکہ آدم و حوا کے گنہگار ہونیکے سبب سے ہر فرد انسان کی پیدایش گناہ آلودہ ہوتی ہے اور چونکہ گناہ سے
خدا کو نفرت ہے۔ اسلئے اگرچہ بچے ہنوز کوئی گناہ دیدہ و دانستہ نہیں کیا تو بھی اُس گناہ آلودہ پیدایش طبیعت کے
سبب سے ہم خدا کے غضب کے مستوجب پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے افسیوں ۲: ۳ میں ذکر ہے پس جبتک
کہ ایسی طبیعت جو گناہ سے مبرا ہو روح میں پیوندی کی جائے خدا ہمسے راضی نہیں ہو سکتا یہہ طبیعت

خدا ہم کو بپتسمہ کے وسیلے سے دیتا ہے۔ اور نئی پیدائش کہلاتی ہے ممکن ہے کہ وہ بڑے عرصہ تک پوشیدہ
اور بے تاثیر رہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ وہ نیست بھی ہو جائے۔ جیسا کوئی تخم جو کھیت میں بویا جاتا ہے۔
اگر کسی طرح کی پرورش نہ پائے تو مر جاتا ہے۔ اور جب تک ہم اس بدنِ فانی میں موجود رہتے ہیں
ضرور ہے کہ وہ۔ پرانی گناہ آلودہ طبیعت بھی کم و بیش اُس کے ساتھ ساتھ رہے مگر پھر بھی اِن باتوں
سے اس بات میں کچھ خلل نہیں آتا کہ خدا بپتسمہ کے وقت اور اُس کے وسیلہ سے اِنسان کے
دل میں نئی الٰہی زندگی پیدا کرتا ہے۔ اور جو لوگ اُس زندگی کو بڑھاتے ہیں۔ ان میں وہ روز بروز ترقی
کرتی جاتی ہے۔ اور آخرکار تمام بدی کو ان کے دلوں میں سے خارج کر کے خود ان میں بستی اور روز
قیامت میں اِن کے بدنوں کو بھی اپنی تاثیر مبارک سے بھر دیگی۔

۷۔ اگرچہ یہہ نئی پیدائش محض خدا کا انعام ہے اور کوئی اُس کا اپنی ذات سے مستحق نہیں ہو سکتا
اور اس سبب سے جیسے بالغوں کو ویسے ہی نابالغوں کو بھی مل سکتی ہے۔ تو بھی واجب و معقول ہے کہ بالغ
آدمی جب تک کہ بعض شرائط ادا نکرے اُسکو نہ پائے کیونکہ بالغ آدمی اس سبب سے کہ بالغ ہے اور دیدہ و
دانستہ خدا کے فضل کو پا سکتا اور رد بھی کر سکتا ہے۔ اگر اُسکو قبول نہیں کرتا تو اُسکو ضرور رد کرتا ہے۔ وہ بچہ کی
مانند نہیں ہو سکتا جس پر خدا جیسا چاہے۔ اثر ڈال سکے۔ اُسمیں بہت سی بُرائیاں داخل ہو چکی ہیں جنہیں
ضرور ہے کہ وہ نفرت اور غم اور شرم کے ساتھ خارج کرنے کی کوشش کرے۔ ورنہ خدا کا فضل اس
میں جگہہ نہ پائیگا۔ پھر اس کے علاوہ یہہ بھی ضرور ہے کہ جو فضل خدا اُس کو دیتا ہے اور جن نعمتوں کا
وعدہ اُس سے کرتا ہے انہیں وہ بغیر شک و شبہہ کے قبول کرے۔ جیسے حضرت مریم نے خدا کی اُس
نعمت و وعدہ کو یہہ کہکر قبول کیا کہ دیکھو میں خداوند کی بندی ہوں تیرے سخن کے مطابق
مجھ سے سلوک کیا جائے (لوقا ۱: ۳۸) چنانچہ جہاں کہیں اس کا ذکر ہے کہ رسولوں نے بالغوں کو بپتسمہ

دیا وہاں یہہ بھی ظاہر ہے۔ کہ اُنہوں نے ان دو شرطوں یعنی توبہ اور ایمان پر بڑی تاکید کی۔
اور بغیر ان کی علامتیں دیکھے بپتسمہ نہیں دیا دیکھو اعمال ۲: ۳۸ و ۴۱ و ۸: ۱۲ و ۳۷ و ۹: ۶ و ۱۸ و ۱۰: ۴۷
و ۱۶: ۱۴ و ۱۵ و ۳۱ تا ۳۴ و ۱۸: ۸ و ۱۹: ۵ کو۔

۷۔ پس بچوں کی نسبت ہم کیا کہیں؟ اُن سے تو توبہ اور ایمان صادر نہیں ہو سکتے۔ پس کیا وہ
بپتسمہ سے محروم رہیں جب تک کہ توبہ نکریں اور ایمان نہ لائیں؟ ہرگز نہیں کیونکہ اگر یہہ صحیح ہو
تو ان کو کہنا۔ کہ تم خدا کی اولاد اور شریعِ مسیح کے عضو ہو؟ کبھی درست نہوگا۔ جب انتظام موسوی
میں بھی جس میں خدا کا فضل بہت ہی کم ظاہر کیا گیا۔ لڑکے مختون ہونے سے اُس عہد کی تمام
برکتوں اور نعمتوں میں جو خدا نے بنی اسرائیل سے باندھا تھا شریک ہوتے تھے۔ تو کیا اِس نئے
عہد کے انتظام میں جس میں خدا کا فضل بے حد اور بے مزاحمت ظاہر کیا گیا ہے لڑکے اِس
عہد کے باہر اور خدا سے دور اور اُس کے فضل سے محروم رہیں؟ ہرگز نہیں لیکن یہہ امر صرف
ہمارے قیاس پر منحصر نہیں۔ بلکہ مسیح کے اُس قول سے صاف نکلتا ہے جو اُس نے بچوں کی نسبت
کہا۔ دیکھو متی ۱۹: ۱۳ تا ۱۵ و مرقس ۱۰: ۱۳ تا ۱۶ و لوقا ۱۸: ۱۵ تا ۱۷ کو۔ لوقا ۱۸: ۱۵ سے ظاہر ہے کہ
یہہ فی الحقیقت بچے تھے جو توبہ اور ایمان کے قابل نہیں۔ پس ایسے بچوں کی نسبت مسیح کہتا ہے
کہ خدا کی سلطنت اُن کی ہے۔ اور مسیح کے محاورہ میں خدا کی سلطنت میں شریک ہونے کی یہہ
نسبت اس جہان میں کسی انسان کا اعلیٰ درجہ ممکن نہیں۔ بلکہ جیسا مسیح نے اُسی موقعہ پر فرمایا
بالغ آدمی جب تک کہ بچے کی مانند خدا کی سلطنت کو قبول نہیں کرتا اُس میں داخل نہوگا
پس کونسی شی بچوں کو خدا کی سلطنت میں داخل ہونے سے روک سکتی ہے۔ بالغوں میں تو بہت سی
روکنے والی چیزیں ہوتی ہیں۔ پس بالغ بغیر توبہ اور ایمان کے کہ جن کے ذریعہ سے وہ ان مزاحمت

کو خارج کرتا ہی داخل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اگرچہ بالغ توبہ کرے اور ایمان نہ لاکے بپتسمہ پائے تو
اُس کا بپتسمہ باطل ہی۔ لیکن بچہ میں کوئی روکنے والی چیز ہنوز موجود نہیں پس اُس کو خُدا کی
سلطنت میں داخل ہونے کے لئے توبہ اور ایمان کی کچھ حاجت نہیں۔ یہہ راز اُسوقت کے
شاگردوں نے نہیں سمجھا اور اسی سبب سے اُنہوں نے ان بچوں کے لانے والوں کو ڈانٹا۔ اُن کی
رائے آج کل کے چند مسیحیوں کی رائے کی مانند تھی۔ جو گمان کرتے ہیں کہ خدا کے فضل کو ہماری عقل
کی حاجت ہی اور اُس واسطے جب تک کہ آدمی کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ اُس وقت تک اُس کو بپتسمہ
نہیں دیتے۔ لیکن یقین ہی کہ مسیح اِن سے ایسا ناراض ہوتا ہی۔ جیسا وہ اُس وقت اپنے
شاگردوں سے ہوا +

اِس سبب کے علاوہ جیسا سوال و جواب میں ذکر ہی بچوں کے بپتسمہ پانے کا یہہ بھی ایک سبب
ہی کہ جو اقرار و وعدہ بپتسمہ لینے والوں کو کرنا چاہئے اُس کو اُن کے ضامن اُن کے بپتسمہ کے
وقت کرتے ہیں + اور جب وہ بالغ ہو کر خود توبہ اور ایمان کے قابل ہو جاتے ہیں۔ تو اُنکو خود یہہ
کہنا نہایت لازم ہوتا ہی ورنہ خدا کا فضل جو اُنہیں بپتسمہ کے وقت ملا۔ وہ اُن کے لئے باطل
لاحاصل ہوگا +

۸۔ عشائے ربانی مسیح کی موت اور اُن نعمتوں کے یادگار میں جو اُس موت سے ملتی
ہیں مقرر ہوئی لیکن نہ صرف ان نعمتوں کی یادگاری کے لئے بلکہ خود ان نعمتوں کے پانیکا وسیلہ ہونیکے
لئے بھی عشائے ربانی مقرر ہوئی۔ جیسے کہ اس سبق کے دوسرے جواب میں ذکر ہی +

۹۔ جس طرح سے کہ مسیح نے گناہوں کے دھونے کے لئے پانی کو مقرر کیا۔ اُسی طرح
اُس نے ہماری باطنی پرورش کے لئے دنیا کی عام چیزوں میں سے دو کو انتخاب کیا + اس کے

علاوہ مسیح نے اپنے آپ کو روٹی سے خاص تشبیہ دی اور خدا کے تمام کلام میں انگور کا درخت اُسکی کلیسیا کی علامت بیان ہوا ہے۔ دیکھو یسعیاہ ۵: ۱ تا ۷، حزقیل ۱۵ باب، و یوحنا ۶: ۳۲ تا ۳۵ و ۴۸ تا ۵۱ و ۵۳ تا ۵۸ و ۱۵: ۱ تا ۸ کو بعض لوگ کہتے ہیں کہ انگور کے جس رس میں کچھ نشہ نہو۔ عشائے ربانی میں اُس کا استعمال کرنا چاہیے۔ لیکن اِس کے لیے مطلق کوئی دلیل نہیں کہ یہودی انگور کا وہ رس پیتے تھے جس میں نشہ نہوتا تھا۔ اور اگر جس طرح یہودی مے پیتے تھے ہمیں بھی پیا جاتا تھا یعنی بہت ہلکا اور پانی سے ملا ہوا اس طرح عشائے ربانی میں پیا جائے تو نشہ کے ذکر کرنے کی کچھ حاجت نہیں ؁

۱۰ مسیح نے جس وقت روٹی دی تو کہا کہ کھاؤ۔ یہہ میرا بدن ہے۔ اور انگور کی شراب دیتے وقت کہا کہ یہہ میرا لہو ہے پس گرچہ ان اقوال کے معنے بہت عمیق ہیں۔ تو بھی سچائی میں کچھ شک نہ لاکر یہہ اقرار کرنا لازم ہے۔ کہ عشائے ربانی میں جو باطنی جزو ہے۔ وہ مسیح کا بدن اور لہو ہے۔ اُس نے یہہ نہیں کہا کہ روٹی اور مے میرے بدن اور لہو سے بدل گئی ہیں۔ اور اسواسطے ہم نہیں کہہ سکتے کہ جو لوگ نالائق طور پر اور تیار نہو کر عشائے ربانی میں شریک ہوتے ہیں۔ اُن کو مسیح کا بدن اور لہو ملتا ہے۔ مگر پھر بھی جو ایمان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح سے فی الحقیقت اُس بدن اور اُس لہو کو لیتے اور حاصل کرتے ہیں۔ لینے کا طور تو اور بات ہے جس میں شاید مسیحیوں کا کامل اتفاق نہیں ہو سکتا لیکن لینا کسی طرح کا کیوں نہو تمثیل یا تشبیہہ کی بات نہیں بلکہ حقیقی ہے ؁

۱۱ عشائے ربانی کے مطلب بہت ہیں اور اس میں لائق طور پر شریک ہونے سے مختلف فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن وہ سب اِس بات میں مندرج ہو سکتے ہیں۔ کہ جس

طرح سے ہمارے بدن روٹی اور انگور کی شراب سے مضبوط وتازہ ہوتے ہیں۔ اِسی طرح سے ہماری روحیں مسیح کے بدن اور لہو کے ذریعہ سے مضبوط اور تازہ ہوتی ہیں۔ کہ خدا کے کام کرنے اور اُس کے دشمنوں سے لڑنے اور تکلیفات کو اُٹھانیکے بہت زیادہ قابل ہوتی ہیں +

۱۱ عشائے ربانی میں شریک ہونے سے پیشتر اپنے آپ کو جانچنا چاہئے جیسا ۱ قرنتیوں ۱۱: ۲۸ میں لکھا ہے۔ کیونکہ جیسا اُسی باب کی ۲۷ و ۲۹ آیتوں میں ذکر ہے۔ اِس میں نالائق طور پر شریک ہونا نہایت ہی خطرناک ہے۔ اور جب تک کہ کوئی اپنے دل کو نہ آزمائے وہ ہرگز نہیں جان سکتا ہے۔ کہ میرے دل کا اسوقت کیا حال ہے + البتہ جس قدر کوئی عرصہ کے بعد شریک ہوتا ہے۔ اُسی قدر یہہ آزمایش زیادہ ضروری اور مشکل بھی ہوتی ہے۔ اور جو ہر اتوار کو شریک ہوتا ہے وہ زیادہ آسانی سے اپنے دل سے بغیر خاص آزمایش کے بھی واقف ہو سکتا ہے۔ مگر پھر بھی ہر مرتبہ گو کہ روز مرہ بھی ہو۔ کچھ نہ کچھ اپنے دل کو آزمانا چاہئے + پس اِس آزمایش میں خصوصاً کیا دیکھنا چاہئے ؟ وہی توبہ اور ایمان جو بالغ کے بپتسمہ کے لئے بھی ضروری ہیں + توبہ کئے اور ایمان لائے بغیر کوئی بالغ خدا کی سلطنت میں داخل نہیں ہو سکتا اور اُن کے بغیر کوئی اِس میں نہ قایم رہ سکتا نہ ترقی کر سکتا ہے یہی دو شرطیں ہیں جن پر خدا تاکید کرتا ہے اور جن کے بغیر وہ ہمکو کچھ روحانی نعمت دے نہیں سکتا اور سکرامنٹ لا حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں یہہ دو شرطیں موجود ہیں وہاں خدا باقی سب نعمتیں بھی دیتا ہے یہاں توبہ کے دو اجزا بیان ہوئے ہیں یعنی ماضی اور مستقبل اور اِن دونوں کا جو علاقہ توبہ کے ساتھ ہے۔ اُس کا ذکر بھی ہوا ہے۔ ماضی میں تو جتنے گناہ ہم سے ہوئے ہیں اُن سے پھر جانا اور نفرت رکھنا اور اُن کے حق میں افسوس اور ماتم کرنا اور شرمندہ ہونا ضروری ہے اور آیندہ کے لئے یہہ ارادہ مصمم کرنا کہ گناہ سے دور رہینگے

اتنا ہی ضروری ہے۔ پھر ایمان کا خاص مطلب اس کے دو ضروری نتایج بھی یہاں مذکور ہوئے
ہیں جب سے خدا کی بقیاس رحمت مسیح میں ظاہر ہوئی ہے اُس وقت سے ایمان کا ایک جزو یہہ بھی
سمجھا گیا ہے۔ کہ اُس رحمت پر بھی اعتقاد رکھیں + اِس اعتقاد کو محض عقل سے تسلیم کرنا نہیں
بلکہ "زندہ ایمان" سے اِس کو پکڑنا لازم ہے + اِس واسطے ایمان کا جو پہلا نتیجہ یہاں مذکور ہے۔ وہ
یہہ ہے کہ ہم مسیح کی موت کو شکرگذاری کے ساتھ یاد رکھیں۔ کیونکہ جو ایسا نہیں کرتا اُس کا ایمان
باطل ہے اور وہ عشائے ربانی کے لایق نہیں + پھر دوسرا نتیجہ یہہ بھی مذکور ہوا۔ کہ سب آدمیوں
سے یعنی جتنے آدمی ہم سے کسی طرح کا علاقہ رکھتے ہوں اُن سب سے محبت رکھیں۔ اور نہ
صرف سب کینہ بغض ڈاہ اور غصہ کو دور کریں۔ بلکہ سب آدمیوں کے خیرخواہ ہو کر اُن کی
روحانی اور جسمانی فایدہ کے لیئے کوشش کرنے اور اپنا نقصان اُٹھانے کو بھی مستعد رہیں
یہہ سچی محبت ایک تو مسیح کی موت پر زندہ ایمان رکھنے کا ضروری نتیجہ ہے۔ کیونکہ جب مسیح نے ہم
سے ایسی محبت رکھی ہے کہ ہمارے بچانے کے لئے اپنی جان کو بھی دریغ نہ کیا۔ تو کون اِس بات پر زندہ
اعتقاد کر کے اپنے بھائی یا ہمجنس سے محبت کئے بغیر رہ سکتا ہے؟ اور دوسرے وہ عشائے ربانی
خاص ضروری شرط بھی ہے۔ کیونکہ اِس عشائے مقدس میں سب طرح کے لوگ ایک ہی میز کے
سامنے گھٹنے ٹیک کر ایک ہی روٹی میں سے کھاتے اور ایک ہی پیالہ میں سے پیتے ہیں جس
سے اُن کی یگانگی کی زیادہ پختہ علامت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر اُن میں محبت نہو تو یہہ سب کچھ
باطل ہوا۔ پس اپنی آزمایش کرتے وقت خصوصاً یہہ باتیں دیکھنی چاہئیں یعنی (۱) پچھلے گناہوں
سے پھر جانا (۲) آیندہ میں پاک رہنے کا قصد (۳) مسیح کی موت پر زندہ ایمان (۴) اُس کو
شکرگذاری سے یاد کرنا۔ (۵) سب آدمیوں سے محبت رکھنی + اگر یہہ پانچ باتیں ہمارے دلوں میں پائی

جائیں تو ہم بے کھٹکے اور دلیر ہو کر عشائے ربانی میں شریک ہو سکتے ہیں +

نوٹ

لفظ سکریمنٹ کے اصل معنے کا جو تھوڑا سا بیان اوپر ہوا ہے۔ اسکو ذرا اور مفصل
اور صاف کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لاطینی زبان میں اُس سے مراد سپاہیوں کی وہ
قسم تھی جو وہ فوج میں داخل ہوتے وقت یا تے سپہ سالار کے ماتحت لڑنے کو نکلتے
وقت کھاتے تھے۔ یہ معنے بپتسمہ پر بخوبی صادق آتے ہیں اور اُس سے تھوڑا ہی
کم استحکام عشائے ربانی اور تقرر اور کم و بیش اور مسیحی رسوم پر بھی صادق آتے ہیں +
لیکن پیشتر اس سے کہ لاطینی بولنے والے مسیحی ہونے لگے۔ یونانی مسیحی اپنی زبان کے
لفظ "موستری" کو استعمال کرتے تھے۔ اس لفظ کا اطلاق خصوصاً ایسے واقعہ
یا عقیدہ یا رسم پر تھا جس میں کوئی باطنی مطلب پوشیدہ ہے۔ جیسا مقدس
پال افسیوں ۵: ۳۲ میں مسیحی نکاح کو۔ یونانی زبان میں "موستری" کہتا ہے + بعد
ازاں لاطینیوں نے اس لفظ کا سکرامینٹ کے لفظ سے ترجمہ کیا۔ اور انہی کا
لفظ زیادہ رائج ہوا +

حصہ دوم

ترتیبِ استحکام کی تفسیر

اس ترتیب میں جو دیباچہ ہے وہ باقی ترتیب کے بعد تصنیف ہوا - اور اس لئے کہ وہ باقی ترتیب کی بہ نسبت کم قدر اور کم ضروری ہے - اکثر اسقوف اس کو خود نہیں پڑھتا - بلکہ دوسرے کسی خادم دین سے پڑھواتا ہے ۔

دیباچہ کے بعد جو سوال اسقوف مستحکم ہونے والوں سے کرتا ہے وہ نہایت ہی غور و لحاظ کے لائق ہے اور اُس کے جواب میں جو کہا جاتا ہے کہ ہاں میں ایسا ہی کرتا ہوں - اس سے زیادہ قابل لحاظ اقرار کوئی کسی سے نہیں کر سکتا - جس طرح نکاح کی ترتیب میں جب کوئی مرد یہہ سنکر کہ کیا تو اس عورت کو اپنی بیاہی زوجہ کرکے لیگا ہے یا کوئی عورت یہہ سوال سنکر کہ کیا تو اس مرد کو اپنا بیاہا شوہر کرکے لیگی ہے اور یہہ جواب دیکر کہ ہاں میں اس کو لیتا یا لیتی ہوں پھر کبھی جبتک کہ اس کی زوجہ یا شوہر زندہ ہے اپنے اس قول کو نہیں ہٹا سکتا بلکہ اگر اس کو ہٹانے چاہے تو زانی کہلائیگا اور اسی طرح سے کوئی خادم دین یہہ سوال سنکر کہ کیا تو اپنی دانست میں اس خدمت کی تعمیل کے لئے خدا سے بلایا گیا ہے اور یہہ جواب دیکر کہ ہاں - میں ایسا ہی سمجھتا ہوں - پھر کبھی اس خدمت سے ہٹ نہیں سکتا - بلکہ اگر اس سے ہٹنا چاہے تو خدا کے گھر کا چور ٹھہریگا - اسی طرح سے جو شخص استحکام کے وقت یہہ "ہاں" کہتا ہے وہ اُس سے پھر کبھی ٹل نہیں سکتا - بلکہ اگر ٹلے تو خدا کا بڑا قصوروار ہوگا + زندگی بھر غیر مستحکم رہنا اس سے نہایت بہتر ہے - کہ استحکام

کے وقت یہہ لفظ ہاں دل سے نہیں - بلکہ زبان سے کہا جائے استحکام سے پیشتر اور خصوصًا جب تک اُس کی تیاری ہوتی ہے - یہہ بات سوچ کر اپنے دل میں یقین کر لینے کیلئے وقت بہت ہے - کہ آیا میں اپنی زندگی کو مسیح کی خدمت یا اپنی خوشی میں گذرانونگا - کیونکہ زندگی گذراننے کے ان دو مطلبوں کے سوا کوئی تیسرا مطلب نہیں ہو سکتا اور ان دونوں کے بیچ میں گویا ادھر میں لٹکا رہنا بیوقوفی کی حد ہے + بس چاہئے کہ استحکام کے وقت کسی کے دل میں کچھ شبہہ باقی نرہے - بلکہ ہر شخص دل کی صفائی کیساتھ کہہ سکے کہ "ہاں" اور اگر یہہ نہ کہہ سکے - تو استحکام کیلئے نہ آئے + اور یہہ اس کا بھی ایک سبب ہے - کہ جو بالغ ہو کر بپتسمہ لیتے ہیں اُنکو بھی مستحکم ہونا مناسب ہے - البتہ طفولیت میں جو بپتسمہ لیتے ہیں مستحکم ہونیکی جیسی ضرورت ہے ویسی اُن کے ہونیکی نہیں ہے جو اپنے بپتسمہ کے وقت خود اپنی زبان سے جواب و اقرار کر چکے ہیں + لیکن اگرچہ ضرورت کم ہے - تو بھی مناسبت بہت ہے کیونکہ بپتسمہ کے لئے کتنی ہی اچھی اور کتنے ہی عرصہ کی تیاری کیوں نہ ہوئی ہو - تو بھی ممکن نہیں کہ مسیحی زندگی کا پورا تجربہ اُس وقت حاصل ہوا ہو - اُس کا مزہ نیا ہے - اور جبتک نو مرید اُس مزہ کو کچھ عرصہ تک نہ چکھ چکا ہو - ممکن ہے کہ وہ اُس سے نفرت کرے اور اپنے بپتسمہ کا انکار کرنا اور مسیح سے پھر جانا چاہے بس یہہ نہایت مناسب ہے اگر اُسکا یہہ حال نہو تو اُس کو کلیسیا کے سامنے کہنے کا موقع ملے کہ مسیحی زندگی کا جو مزہ مینے ہنوز چکھا ہے وہ مجھے نہایت ہی شیریں معلوم ہوتا ہے - اور مینے اپنے دل میں یہہ ارادہ مصمم کیا ہے - کہ جو ہو سو ہو میں اپنے منجی عزیز کو کبھی نہیں چھوڑونگا - بلکہ اُس کی مدد سے میں اپنی تمام زندگی کو اُس کی خدمت میں قربان کرونگا - جو کوئی خواہ بچپن اور خواہ بلوغت میں بپتسمہ پا کر دیدہ و دانستہ ایسا کہہ سکتا ہے - وہ استحکام کے لئے تیار ہے وہ اسقف کے سوال کے جواب میں "ہاں" بخوبی کہہ سکتا ہے +

یہہ جواب مستحکم ہونیوالوں کی زبان سے سُنکر اسقوف بخوبی اس سے خوب واقف ہی کہ کوئی آدمی ایسا وعدہ از خود پورا نہیں کر سکتا بڑی آواز سے سب کے نام سے کہتا ہی کہ "ہماری کمک خداوند کے نام میں ہی" اور مستحکم ہونیوالے یہہ بات اپنے دلوں میں تسلیم کرکے یہہ جواب دیتے ہیں کہ "جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا" یہہ قول جو یہاں دو حصّے کیا گیا مزمور ۱۲۴:۸ میں پایا جاتا ہی۔ پہلے داؤد نے مصیبتوں سے گھبرا کر اور سیکڑوں برس بعد اسیری سے لوٹ کر یہودیوں نے اپنی نہایت پست حالی میں اس قول سے اپنے دلوں کو سنبھالا اور جو کام کرنے کو خدا اُنہیں بُلاتا تھا اُس کے لئے کمر باندھنے کو مستعد ہوئے اور مستحکم ہونے والوں کی دلیری اور ہمت باندھنے کی اس قول سے بہتر وجہہ نہیں ہو سکتی کیونکہ جو ایسا قادر ٹھہرا کہ جو زمین اور آسمان اور جو کچھ اُن میں ہی سب پیدا کر سکا۔ اگر وہ ہماری طرف ہو۔ تو کون ہمکو جیت سکتا ہی؟ اور جو سچائی سے اُسکی خدمت کرنی چاہتے ہیں۔ انکی طرف وہ کیوں نہو؟ پس اس بات کو یقین کر کے اسقوف اور مستحکم ہونیوالے باری باری اُس کی تعریف و شکر گذاری کرنے لگتے ہیں کہ "اب سے ابد الآباد" مگر پھر اپنی کمزوری اور نالائقی کی طرف اور ایک بار نگاہ کر کے وہ دونوں منت کرنی شروع کرتے ہیں۔ اسقوف کہتا ہی کہ "اے خداوند ہماری دعاؤں کو سُن" اور وہ لوگ یہہ جواب دیتے ہیں "اور ہماری زاری تجھ تک پہنچنے پائے"۔

اس کے بعد جو دعا اسقوف پڑھتا ہی۔ اُس میں خاص دو باتیں ہیں جو ہمارے غور کے لائق ہیں۔ پہلی بات وہ فضل ہی۔ جو اُس میں خدا سے مانگا جاتا ہی کہ وہ مستحکم ہونے والوں سے کرے وہ مضبوط کرنا ہی دعا یہہ ہی۔ کہ "اے خداوند ہم تیری منت کرتے ہیں کہ اُس رُوح القدس سے اُنہیں مضبوط کر جو سنبھالنے والا یا تسلّی دینے والا ہی۔ جاننا چاہئے کہ یہہ رسم جو

استحکام کہلاتی ہی۔ اسکے دو سبب ہیں + ایک تو جو اُسکے لئے حاضر ہوتا ہے۔ وہ انہیں
ان سب عہدوں کو جو اُسکے دھرم باپ اور دھرم ماں اسکے عوض کر چکے ہیں۔ یا وہ اپنی زبان
سے کر چکا ہے۔ دوہراتا اور مضبوط اور مستحکم کرتا ہے + جیسا کوئی روپیہ دینے کا وعدہ کسی کاغذ
پر لکھکر اُسکے نیچے دستخط کئے جاتے ہیں یا اگر وہ وعدہ زیادہ روپیوں کا ہو تو محض دستخط پر
کفایت نہ کرکے اسکے ساتھ اپنی مہر لگائی جاتی ہی یا اگر کچہری کا کام ہو تو سرکاری اشٹامپ پر
دستخط کرتا ہی تاکہ اُسکے ذریعہ سے کسی کے دلمیں شبہہ نہ رہے۔ بلکہ سب کو یقین ہو کہ وہ اس عہد
کو پورا کریگا۔ اسی طرح مستحکم ہونیوالے پہلے اپنے بپتسمہ میں کئے ہوئے عہدوں کو اسقوف اور
کلیسا کے سامنے مستحکم کرتے ہیں اور گویا اُن پر مہر اور دستخط کرتے ہیں + پھر جب وہ یہ کر چکتے
ہیں۔ تو خدا اپنی طرف سے انہیں مستحکم اور مضبوط کرتا ہے + جب وہ اپنے وعدوں کے مستحکم
کرنیسے یہ ظاہر کر چکتے ہیں کہ ہمارا انہیں پورا کرنیکا ارادہ مصمم ہے۔ تو اس شرط پر خدا انہیں
قبول کر لیتا ہی اور خود اُنکے دلوں اور انکی روحوں کو ایسا مستحکم کرتا ہے۔ یعنی اپنے فضل سے
انہیں ایسا سنبھالتا ہے اور مضبوط کرتا ہے۔ کہ وہ آئندہ اُن عہدوں کو پورا کر سکتے ہیں +
ولادت ثانی اور نئی زندگی تو انہیں حاصل ہو چکی ہے۔ اور اُنکے سب پچھلے گناہ معاف
ہوئے۔ ورنہ کوئی موجود نہ ہوتا جو مستحکم ہو سکے + لیکن اب اس نئی زندگی کی طاقت الٰہی
بڑھائی جاتی ہے کہ وہ اپنا کام کرنا شروع کر سکے اور اپنے کو دنیا میں ظاہر کر سکتی ہے +

دوسری بات یہ ہے کہ اس کام کے کرنے کے لئے طرح طرح کی نعمتیں و طرح طرح
کی نعمتوں کا دینیوالا روح القدس اس دعا میں مانگا جاتا ہے۔ یسعیاہ ۱۱: ۲ کی طرف اشارہ
ہے۔ اس مقام میں مسیح کی نسبت (دیکھو ۱۔ آیت کو) یہ پیشینگوئی ہے کہ حق تعالیٰ کی روح حق

نازل ہوگی اور رہیگی اور اسکے بعد یہہ بیان ہے - کہ یہہ روح کن کن نعمتوں کی بخشنے والی ہے
اور کونسی نعمتیں اُس روح کے نزول کے سبب سے مسیح میں ظاہر ہونگی + اس پر یہہ اعتراض
ہو سکتا ہے - کہ جو مسیح کی نسبت پیشینگوئی ہے وہ کس طرح سے ہم مسیحیوں پر صادق آسکتی ہے؟
اسکا جواب یہہ ہے کہ مسیح کی پیشینگوئیوں میں جو باتیں اسکی انسانی ذات سے علاقہ رکھتی ہیں
اُنکے سوا کوئی ایسی بات نہیں جو مسیح کی اُمت پر بھی صادق نہ آئے اور خصوصاً روح القدس
اسی واسطے مسیح پر نازل ہوا کہ وہ اسے اپنے سب پیرؤں کو دیوے - یہہ وہ بیش قیمت
تیل ہے جس سے ہمارا حقیقی ہارون جو ہمارا سر بھی ہے ممسوح ہوا اور جو اُس سر مبارک پر سے
بہہ بہہ کر اسکی چھاتی تک بلکہ اُسکے پیراہن کے کنارہ تک پہنچا + دیکھو زبور ۱۳۳: ۲ کو +
جیسا یوحنا ۷: ۳۹ میں ذکر ہے جب تک مسیح جلال کو نہ پہنچا جو روح اُس پر نازل تھی وہ
اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی - لیکن جب مسیح مرا اور جی اُٹھا اور آسمان پر چڑھا -
تو اُسنے اپنے وعدہ کے مطابق درخواست کر کے یہہ اختیار حاصل کیا - کہ وہ روح القدس
اپنی کلیسیا پر بہا دے + چنانچہ جیسا حصہ اسبق ۲ میں ذکر ہوا + روح القدس جو روز پنتیکوست نازل
ہوا وہ خصوصاً مسیح ہی کی روح ہو کر آیا - اس سبب سے جتنی اور جیسی نعمتیں اُس روح کے سکونت
رکھنے سے مسیح میں ظاہر ہوتی تھیں - اُتنی اور ویسی ہی نعمتیں اُسی روح کی سکونت کے
سبب ہم میں بھی ظاہر ہو سکتی ہیں + یسعیاہ ۱۱: ۲ میں جو خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے اُسکو ہم بے کھٹکے
اپنے پر بھی صادق لا سکتے ہیں + جن نعمتوں کا مقام مذکور میں ذکر ہے وہ تو چھ ہیں لیکن بیان ترتیب
استحکام میں چھٹی نعمت کو دو حصے کر کے سات نعمتیں شمار کی گئی ہیں + چھہ مذکورہ نعمتیں تین جوڑوں
میں منقسم ہیں - پہلا جوڑا حکمت و خرد کا ہے - غالب ہے کہ ان دو کا فرق یہہ ہے کہ حکمت سے

دین کے اسرار کے سمجھنے کی قوت وخرد سے انسان کی دلی ضروریات کے سمجھنے کی قوت
مراد ہے کیونکہ ان دونوں کے بغیر خُدا کیواسطے بہت کام نہیں ہوسکتا۔ دُوسرا جوڑا
مصلحت اور پہلوانی کا ہے۔ جو کچھ عقل سے سمجھنا درکار ہے جب ہم اسکو سمجھ چکتے ہیں۔
تو بھی اسکا عمل میں لانا باقی رہتا ہے + پس کام کے لئے مصلحت کی نعمت درکار ہے تاکہ ہم جانیں
کہ کس طرح کام کریں اور جانکر اسکے کرنیکا ارادہ کریں۔ لیکن اسپر بھی کفایت نہیں ہوتی
اکثر دفعہ ہم بخوبی جانتے اور ارادہ کرتے بھی ہیں اور ہمارے علم اور ارادہ میں کسی طرح کا نقص
نہیں۔ مگر پھر بھی کام بخوبی نہیں ہوتا۔ اسکی وجہ کیا ہے؟ اسلئے کہ تعمیل کے لئے طاقت اور دلیری
چاہئے اور یہہ صفتیں ہم میں کم موجود ہیں + اپنے جسمانی اور روحانی دوستوں کا پھُسلانا
اور دشمنوں کی مخالفت اور تسخیر ابلیس کی آزمائشیں یہہ اور بہت طرح کی مزاحمت
ہم کو ایسی روکتی ہیں کہ پہلوان نہ ہوں اور پہلوانی نہ کریں۔ پس یہہ بھی رُوح القدس
کی ایک نہایت ضروری نعمت ہے۔ لیکن یہہ چاروں نعمتیں بھی کافی نہیں۔ یہہ سب
اُس حق تعالیٰ کے پاس سے جو سب خوبیوں کا اصلی چشمہ ہے نازل ہوتی ہے۔ لیکن
مسیحی کا کام نہ صرف یہہ ہے۔ کہ خُدا سے نعمتیں پاکر اُنہیں عمل میں لائے۔ بلکہ یہہ بھی
کہ خود انکے دینے والے اور سرچشمہ کو جانے۔ اور اُس سے تعارف پیدا کرے + پس رُوح القدس کی
کی پانچویں نعمت عرفان یا معرفت ہے یعنی خُدا کو ایسا جاننا جیسے کوئی اپنے باپ کو اور اپنے
دوست کو جانتا ہے یعنی اسکے ساتھ صحبت رکھنے کے سبب اُسکے دل کے اکثر رازوں
سے واقف ہوتا ہے اور اپنے دل کی سب باتیں کھول کھول اُسکے سامنے بیان کر کے
اپنے آپ میں اسکی محبت پر پُورا اعتماد پیدا کرتا ہے + اس طرح کی عرفان حضرت ابرہام اور

موسیٰ رکھتے تھے۔ دیکھو پیدائش ۱۸: ۱۷ تا ۱۹ و ۲۳ تا ۳۳ و خروج ۳۳: ۱۱ تا ۱۷ کو اور مسیح (یوحنا ۱۵: ۱۵ میں) اپنے اِسی طرح کے عرفان کا وعدہ اپنے سب شاگردوں سے کرتا ہے اور جب مسیح کا عرفان حاصل ہوا تو اُسکے ذریعہ سے اب تعالیٰ کا عرفان بھی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اسکے سوا بھی ایک اور نعمت درکار ہے یعنی خدا کا خوف + یہہ وہ نعمت ہے جس کے سبب سے باقی پانچ نعمتیں گویا اپنی اپنی جگہ میں قائم رہتی اور فائدہ مند ہوتی ہیں۔ بلکہ بغیر اسکے سب مضر ہوتی ہیں + بلکہ خدا کا عرفان بھی اگر اُس کے خوف کے بغیر ہو تو بے ادبی پیدا کریگا + جسکو خدا نہیں سہہ سکتا۔ مزمور ۱۱۰: ۱۰ و امثال ۱: ۷ میں لکھا ہے۔ کہ خداوند کا خوف حکمت و دانائی کا شروع ہے یعنی اُسکے بغیر حقیقی حکمت اور دانائی ممکن نہیں اسی طرح مصلحت اور پہلوانی بھی اسی شرط پر اُسی حال میں درست و فائدہ مند ہو سکتی ہے جب خداوند کا خوف دل پر قابض ہے + جس طرح ہمارے سب دنیوی کام صرف روشنی ہی میں درستی سے ہو سکتے ہیں۔ اور تاریکی میں خلل اور ابتری سے نہیں بچ سکتے۔ اسی طرح سے جب ہمارے دلوں میں خداوند کا خوف جاری اور گویا بھرا رہتا ہے تو ہمارے خیال اقوال افعال صحت سے ہوتے ہیں۔ ورنہ بے نقص نہیں ہو سکتے۔ اِسواسطے یہاں یعنی اسقوف کی اس دُعا میں اس نعمت پر یہانتک تاکید کی گئی ہے۔ کہ وہ پہلے دوسرے نام سے یعنے دینداری کے نام سے کہلائی اور اُسکے بعد یہہ اخیری دُعا بہت بڑھکر کیجاتی ہے کہ اے خداوند اپنے پاک خوف کی رُوح سے (یعنی اس کی دینے والی رُوح سے) اب اور ابد تک اُنہیں مالا مال رکھ +

لیکن اب شاید کوئی کہے کہ یسعیاہ ۱۱: ۲ میں مسیح کی جو پیشین گوئی ہے اور جس کی تفسیر

اب ہوئی ہے۔ وہ تو خدمتِ دین پر مقرر ہونیوالے پر بخوبی صادق آتی ہے۔ کیونکہ وہ دنیا میں خدا کے لئے بڑے بڑے کام کرنے کو بلائے جاتے ہیں اور اُن کو حکمت و دانائی معرفتِ پہلوانی خداوند کا عرفان خوف بکثرت چاہئے لیکن مستحکم ہونیوالوں کو ان باتوں سے کیا واسطہ ؟ وہ تو اکثر لڑکے لڑکیاں ہیں۔ اور اُن میں سے اکثروں کو بڑھکر دنیوی کاموں میں مبتلا رہنا پڑیگا۔ پھر انکو روح القدس کی طرف سے ان چھہ نعمتوں کی کیا ضرورت ہے ؟

اس اعتراض کا جواب یہہ ہے۔ کہ استحکام ایک طرح کا تقرر ہے۔ استحکام بپتسمہ نہیں ہے وہ تو بپتسمہ میں ہو چکی ہے۔ استحکام سے کوئی مسیحی نہیں ہوتا وہ تو تب بپتسمہ میں ہو چکے ہیں لیکن یہہ جاننا چاہئے کہ خدا ہم کو اسواسطے مسیحی نہیں کرتا کہ ہم صرف مسیحی بنے رہیں اور آخرکار نجات پائیں اور بس۔ ہرگز نہیں بلکہ خدا ہم کو اسی واسطے مسیحی کرتا ہے۔ کہ ہم اُس کے لئے کام کریں۔ اُس کی سلطنت کی ترقی اور اُسکے دشمنوں کے ہٹا دینے کے واسطے اُن سیا اور آدمیوں کے دلوں کو اسکی طرف پھیرنے اور اُن سے اسکی مرضی پوری کرانے کے لئے کوشش اور محنت کریں۔ تم کہوگے کہ یہہ تو خادمانِ دین کا کام ہے۔ اور تم سچ کہوگے یہہ خادمانِ دین کا کام بھی ہے اور تم بھی خادمانِ دین ہونیوالے ہو۔ ہاں البتہ خادمانِ دین دو قسم کے ہیں ایک تو وہ ہیں جنکا اسکے سوا اور کوئی کام یا پیشہ نہیں اور اس سبب سے اپنی پرورش باقی مسیحیوں سے پاتے ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو اپنی جسمانی پرورش کے واسطے کسی دنیوی پیشہ میں اپنی اوقات بسر کرتے ہیں اور صرف فرصت کے وقت خداوند کی سلطنت کی ترقی کے لئے دیدہ و دانستہ کام کر سکتے ہیں۔ لیکن یہہ سب خادمانِ دین ہیں اور سب پر فرض ہے کہ جہانتک اُن کو فرصت اور موقع ملے وہاں تک ایسے کاموں میں

جن سے خداوند کا عمل بنی آدم میں پھیلے مشغول و مصروف رہیں پس استحکام سب مسیحیوں
کا خواہ مردوں خواہ عورتوں کا خواہ جاہلوں خواہ عالموں کا خدا کا رُوحانی کام دُنیا میں کرنیکے
لئے تقرر ہے۔ اور وہ اُس عُمر میں ہوتا ہے جب لڑکے لڑکیاں اپنے ارادوں سے پہلے بخوبی ادا
ہوکر یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم خداوند کی سلطنت کے لئے محنت کرینگے یا نہیں
کرینگے۔ اور جو کوئی نہیں کرنے چاہتا ہے وہ مستحکم نہ ہو کیونکہ اسکو استحکام سے کچھ کام نہیں ہے +

استحکام کا کلمہ یعنے جو کلمہ اسقوف ہر ایک مستحکم ہونیوالے کے اُوپر اسوقت پڑھتا ہے
جب اسکے ہاتھ اُسکے سر پر رکھے جاتے ہیں ایسا ہے کہ اسکی تفسیر کرنے سے اسکی صفائی
نہیں ہوگی۔ بلکہ اس میں نقص پڑیگا۔ چاہئے کہ ہر ایک مستحکم ہونیوالا اِس کلمہ کے ہر لفظ پر پیشتر سے
خوب غور کرکے مستحکم ہونیکے وقت صرف ہر لفظ کے معنے کو اپنے دل پر نقش ہونے دے +

خُداوند کی دُعا کے بعد جو دُعا اسقوف پڑھتا ہے۔ اس میں ایک بات ہے جسکا ذرہ
لحاظ کرنا چاہئے۔ یہ فکر ہے کہ استحکام میں جو اسقوف کے ہاتھ سر پر رکھے جاتے ہیں۔ وہ رسم
مقدس رسُولوں سے جاری ہوئی۔ اس بات کی دلیلیں ہیں۔ ایک اعمال ۸: ۱۴ تا ۱۷ میں ہے
اس مقام میں یہ لکھا ہے۔ کہ شمرون کے بہت سے باشندوں نے فلپ کے مُنہ سے انجیل سُنکر یا اُسپر
ایمان لاکر بپتسمہ پایا + لیکن جب اس کی خوشخبری رسولوں کے کان تک پہنچی تو اُنہوں نے اس کو
کافی نہیں سمجھا۔ وہ لوگ مسیحی تو ہو چکے تھے اور اس سے یقین ہے کہ وہ رُوح القدس کی تکمیل
بھی ہوئے تھے اور رُوح القدس ان میں سکونت رکھتا تھا۔ لیکن جس طرح سے رُوح القدس نے
روزِ پنتیکوست نازل ہوکر مسیح کے شاگردوں کو ایسی ہی اور بڑی قوتوں سے معمور کیا۔ جنکی مدد
سے وہ فوراً مسیح کے کلام کو گویا اپنا جھنڈا اکھڑا کرکے دنیا پر لیکے اور شیطان کو ہرا ہرا کر

بہت سے لوگوں کو اُسکے قبضہ سے چھڑانے لگے اس طرح روح القدس اُن شمرونیوں پر نازل نہیں ہوا تھا پس یہہ جانکر رسولوں نے پطرس اور یوحنا کو اُنکے پاس بھیجا اور اُنہوں نے انکے سروں پر دُعا کے بعد اپنے ہاتھ رکھے پس فوراً روح القدس اپنی خاص پنتکوست کی قوتوں کے ساتھ اُن پر نازل ہوا۔ ہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسولوں کے سوا اگر اور کوئی مسیحی اپنے ہاتھ اُنپر رکھتا تو وہی نتیجہ نہ ہوتا۔ لیکن جب کلیسیا بہت بڑھ گئی تو ممکن نہیں تھا کہ کوئی رسول ہر جگہ حاضر رہے۔ اور گلتیوں ۳: ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ ما بعد میں یہہ کام ایسے مسیحی سے بھی ہوتا تھا جسکی نسبت اور کچھ معلوم نہیں کہ وُہ کون تھا لیکن یہہ صاف ظاہر ہے کہ رسولوں نے یہہ رسم کلیسیا میں جاری کی اور جب اور لوگ ہاتھ رکھنے لگے تو انہیں کی اجازت و انتظام سے رکھنے لگے اور اس زمانہ میں بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ اسقوف استحکام کے لئے ضرور ہے۔ یعنے جو لوگ جیسا فرانسیسی اور جرمن پروٹسٹنٹوں میں دستور ہے + اپنے عام خادمان دین سے مستحکم ہوتے ہیں وُہ فی الحقیقت مستحکم نہیں ہوتے + لیکن ہم یہہ کہہ سکتے ہیں کہ جیسا رسولوں نے بہتر سمجھا۔ کہ شمرونی نو مریدوں کا استحکام اُنکے بپتسمہ کی بہ نسبت بہت زیادہ علانیہ ہو اور گھر پر نہیں بلکہ سب کو جمع کر کے ہر ایک پر سب کے سامنے ہاتھ رکھے تاکہ یہہ بات زیادہ اُنکے دلوں پر اثر کرے۔ اِسی طرح سے اب بھی اسقوف کا بالکل علانیہ ہاتھ رکھنا بہت بہتر ہے +

دوسری دلیل عبرانیوں ۶: ۲ میں ہے جہاں دوسری آیتوں میں مسیحی دین کے خاص اصولی مسئلوں کا ذکر ہے جنکی نسبت رسول یہہ فرماتا ہے کہ انکو تو تم شروع میں سیکھ چکے ہو اور میرا ارادہ نہیں کہ پھر تمہیں وُہی سکھلاؤں + یہہ مسئلے چھہ ہیں یعنی توبہ اور ایمان اور بپتسمہ ہاتھ رکھنا قیامت اور اخیری عدالت۔ لحاظ کرنا چاہئے۔ کہ اُن میں سے اخیر ہی دو مسئلے

آئندہ واقعات کی نسبت ہیں سواوّل دو باطنی افعال ہیں اور وسطا کے دو ظاہری رسُوم ہیں یعنی
اُن عبرانیوں کو جب وُہ مسیحی ہونیوالے تھے نہ صرف توبہ اور ایمان کی ضرورت اور قیامت اور اخیری
عدالت کا یقین دلایا جاتا تھا۔ بلکہ مختلف بپتسموں یعنی یہودیوں کے بپتسمہ اور یُوحنا بپتسمے کے
بپتسمہ اور مسیحی بپتسمہ کا فرق (دیکھو اعمال ۱۹: ۳ تا ۵ کو) اور ہاتھ رکھنے کے مختلف مطالب
کا راز بھی اُنہیں سمجھایا جاتا تھا + ہاتھ رکھنے کی رسم تو بہت پُرانی ہے اور اُس سے ہمیشہ
یہہ مراد ہے کہ کسی طرح کا اختیار دُوسرے کے سپُرد کیا جاتا ہے + چنانچہ گنتی ۲۷: ۱۸ تا ۲۰ و ۲۲ و ۲۳
استثنا ۳۴: ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ مُوسیٰ نے یشُوع پر اس غرض سے ہاتھ رکھے۔ کہ جو اختیار
وُہ خود بنی اسرائیل پر رکھتا تھا۔ اس میں یشُوع شریک ہو اور اسکی موت کے بعد اُس کے
اختیارات کا وارث ہو۔ مسیح سے پیشتر بھی یہی رسم یہودیوں میں تھی اور مسیحی کلیسیا میں
برابر جاری رہی ہے۔ کہ جو لوگ خدمتِ دین کے لئے مقرر ہوں۔ انکے سر پر کوئی ایسا آدمی یا
چند ایسے آدمی جنہیں خدمتِ دین کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ اپنے ہاتھ رکھکر اُنکو وہی اختیار
دیں۔ یہہ بھی رسم جیسا ہم کہہ چکے ہیں۔ یہودیوں سے مسیحیوں میں جاری ہوئی لیکن مسیحیوں میں
وہ ایسی عام ہوگئی جیسی یہودیوں میں کبھی نہ تھی۔ یعنی جیسا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ مسیح کی کلیسیا
کے نزدیک سب مسیحی لوگ ایک طرح سے خدمتِ دین پر مقرر ہو سکتے ہیں۔ اور اسواسطے
سب کے ساتھ یہہ رسم بھی استعمال میں آئی ہے کہ مستحکم ہونیکے وقت اُنپر ہاتھ رکھے جائیں
لیکن اسکی کیا دلیل ہے کہ عبرانیوں ۶: ۲ میں استحکام کیطرف اشارہ ہے؟ یہہ کہ جب اعمال
۸: ۱۷؛ ۱۹: ۶ سے ظاہر ہے کہ دینی خدمت پر خاص مقرر ہونے والوں کے سوا عام مسیحی لوگوں
کے ساتھ بھی اس رسم کا استعمال ہوتا تھا۔ تو ہم یقین کر سکتے ہیں۔ کہ جب مسیحی ہونیوالوں

کو اول اول تعلیم دیجاتی تھی - تو اس کا ذکر صرف اُن سے نہیں کیا جاتا تھا جو
خاص خدمت پر مقرر ہوتے تھے - بلکہ اِس کے سوا یا شاید اُس کے عوض بھی
اُس تقرر کا ذکر کیا جاتا تھا - جو اُن سب کو مسیحی ہونے کے بعد حاصل ہونے والا
تھا - اور جب اِس طرح سے ثابت ہوا کہ اِس مقام میں ہاتھ رکھنے کی جس رسم کا ذکر ہے وہ
استحکام ہے یا کم سے کم اِس کے معنے میں استحکام داخل ہے - تو اِس سے ہم یہہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ
استحکام تمام مسیحیوں کے لئے رسولوں کیطرف سے یا رسولوں کی اجازت سے ٹھہرائی ہوئی رسم تھی
اور نیز ایسی ضروری رسم اُن کی دانست میں تھی کہ جو لوگ مسیحی نہیں ہوئے بلکہ ہونے کے لئے تعلیم
پاتے ہیں مسیحی دین کی اصولی مسئلوں کے درمیان اس کی تعلیم پاتے تھے مسیحی دین کی اصولی مسئلوں
کے درمیان اس کی تعلیم بھی اُنہیں دیجاتی تھی - اور اس سے ہم یہہ اخیری نتیجہ بھی نکالتے ہیں -
کہ جس رسم کو رسولوں نے تمام مسیحیوں کے لئے اس قدر ضروری سمجھا - اُس کو رد کرنا یا اُس سے
غافل رہنا گستاخی کی حد ہے +

حصہ سوئم

ضمیمہ

سبق (۱) مسیحی زندگی کے مندرجات

۱- خدا اور مسیح کی بندگی کرنی - ۱- تسلونیکیوں ۱: ۹ و کلسیوں ۳: ۲۴ +

۲- خدا اور مسیح کی مرضی پوری کرنی اعمال ۲۲: ۱۰ و ۱ قرنتھیوں ۱۱: ۳ و کلسیوں ۳: ۱۷ +

۳- یعنی اپنی مرضی نہیں بلکہ اُسکی مرضی پوری کرنی - لوقا ۵: ۳۲ و رومیوں ۱۴: ۷ تا ۱۰ - ۲ قرنتھیوں ۵: [illegible] کلسیوں [illegible] +

۴- اور آدمیوں کی مرضی نہیں بلکہ اُسکی مرضی پوری کرنی گلتیوں ۱: ۱۰ و افسیوں [illegible] و کلسیوں [illegible] پطرس ۴: ۲ و متی ۱۶: ۲۳ +

۵- اُسکی مرضی کے مطابق +

(۱) اپنے بدنوں کا استعمال کرنا - ۱ قرنتھیوں ۶: ۱۳ و ۱۴ و ۱۵ و ۱۹ و ۲۰ و رومیوں ۱۲: ۱

(۲) اپنے مال کا خرچ کرنا - لوقا ۱۶: ۱۰ تا ۱۲ +

(۳) اپنے وقت کو بسر کرنا - افسیوں ۵: ۱۶ +

۶- مسیح کی محبت سے متاثر اور گویا دئے ہوئے سب کام کرنا - ۲ - قرنتھیوں ۵: ۱۴ و گلتیوں ۲: ۲۰ +

۷- اسکی دوسری آمد کی راہ دیکھتے رہنا ۱ تسلونیکیوں ۱: ۸ تا ۱۰ +

۸- اُس کے نمونہ کی پیروی کرنی ۔ فلپیوں ۲: ۵ - ۱ پطرس ۲: ۲۱ - ۱ یوحنا ۲: ۶ یوحنا ۱۳: ۱۵ ۔

۹- اور آدمیوں کی بہبودی کے لئے زندگی گذارنی ۔ رومیوں ۱۵: ۲ تا ۳ و ۱ - قرنتیوں ۱۰: ۳۳ ۔ فلپیوں ۲: ۴ و یوحنا ۱۳: ۱۴ ۔

۱۰- خاص آدمیوں سے جو خاص علاقہ رکھتے ہیں ۔ اُن کے فرائض ادا کرنے ۔ افسیوں ۵: ۲۲ - ۶: ۹ و طیطس ۲: ۱ تا ۱۰ و ۳: ۱ تا ۲ ۔

۱۱- اور آدمیوں کی روحانی ترقی کرنی ۔

(۱) اپنے چال چلن کے نمونہ سے ۔

(۲) اپنے کلام سے ۔ فلپیوں ۲: ۱۶ و ۱ پطرس ۳: ۱۵ ۔

۱۲- اُن سے حلیمی اور صبر کرنا ۔ لوقا ۶: ۲۷ تا ۲۹ و کلسیوں ۳: ۱۲ تا ۱۴ و ۱ پطرس ۲: ۲۳ و ۳: ۸ ۔

۱۳- مصیبت کے وقت صبر اور خوشی کرنی ۔ رومیوں ۵: ۳ ۔ یعقوب ۵: ۱۰ تا ۱۱ و ۱ پطرس ۴: ۱۲ تا ۱۳ ۔

۱۴- آزمایش کی نسبت خبردار رہنا اور اُس کا سامنا کرنا ۔ مرقس ۱۴: ۳۸ و ۲ قرنتیوں ۲: ۱۱ و یعقوب ۴: ۷ و ۱ پطرس ۵: ۸ تا ۹ ۔

ہمیشہ شکرگذار رہنا ۔ افسیوں ۵: ۲۰ ۔ کلسیوں ۱: ۱۲ - ۱ تسلونیقیوں

سبق (۲) مسیحی زندگی کیلئے مدد پانے کے وسائل

۱۔ دعا جو تین طرح کی ہو۔ یعنی (۱) جو ایک آدمی صرف اپنے ہی کو حاضر جانکر مانگے خواہ خاموشی سے خواہ آواز کے ساتھ۔

۲۔ علانیہ جس میں جو چاہے وہ شریک ہو سکتا ہو (۳) گھر کی یعنی چند آدمی متفق اور اکٹھے ہو کر مانگیں۔ انھیں سے ہر قسم کی دعا نہایت ضروری ہے۔ اور ہر قسم سے جو خاص فوائد ہوتے ہیں وہ باقی دو قسموں سے نہیں ہو سکتے مگر تینوں سے جو زیادہ ضروری ہے وہ دل کے غیر مسیحی [illegible]

۳۔ دعا خفیہ [illegible] یعنی دعا صرف کبھی کبھی جب دل میں آئے نہیں بلکہ قاعدے سے ہر روز کم از کم دو یا تین بار مانگی چاہئیے۔ دیکھو زبور ۵۵: ۱۷ و ۱۸۔ لیکن پھر دعا مانگنے کے لئے ہر دم ایسا مستعد رہنا چاہئیے (فلپیوں ۴: ۶-۱۔ تھسلنیکیوں ۵: ۱۷) کہ جب کبھی موقع درپیش ہو۔ تو فوراً کام کے بیچ میں کھڑے کھڑے یا بیٹھے یا چلتے چلتے دل خدا کیطرف رجوع کر کے دعا مانگی جائے دیکھو نحمیاہ ۲: ۴ کو۔

دعا کے پانچ اجزا ہیں۔

(۱) حمد و ثنا۔ یعنی خدا کی ذات و صفات کے لئے اِن نعمتوں کو یاد کر کے اس کی تعریف و ستائش کرنی۔ دیکھو زبور ۱۰۳

[illegible] آن سب [illegible]

کی خاطر نازل کرتا ہے خصوصاً اُن برکتوں کے لئے جو ابدالآباد ٹھہرنے والی ہیں۔ دیکھیو مزمور ۲:۱۱۰ کو یہہ خصوصاً شام کا فرض ہے۔

(۳) گناہوں کا اقرار دیکھو مزمور ۳۲ : ۱۰ کو یہہ بھی خصوصاً شام کی دعامیں داخل ہے اس کام میں یہہ چار قاعدے فائدہ مند ہونگے۔ :

(الف) اپنے گناہوں کو یاد کرنے کی کوشش کرو۔

(ب) - اگر سب تم کو یاد نہ آئیں تو مت گھبراؤ۔ خدا سخت خاوند نہیں ہے۔

(س) جو گناہ تم کو یاد آئیں اور جن کو تم بھول گئے ہو سب کے لئے مغفرت مانگو۔

(د) جب حتی المقدور اپنے گناہوں کا اقرار کر چکو اور مغفرت مانگ چکو تو کچھ شک مت لاؤ بلکہ یقین کرو کہ تمہارے گناہ معاف ہوئے ہیں۔ دیکھو ایوحنا ۱ : ۹ کو۔

(۴) درخواست اُن سب فرائض اور آزمائش اور مصیبتوں میں جن کے اُس روز درپیش ہونیکی اُمید ہو۔ خدا سے مدد مانگنی چاہئے ؟ - دیکھو مزمور ۵ : ۳ کو اور یہہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہر روز فرائض آزمائش اور ناگہانی مصیبتیں درپیش ہوتی ہیں پس اُن کے لئے بھی عام طور پر خدا سے مدد مانگنی چاہئے۔

(۵) شفاعت دیکھو اتمطاؤس ۲ : ۱ کو جنھوں سے ہم کسی طرح کا علاقہ رکھتے ہوں۔ جنھوں کی نسبت ہم ایسا کچھ جانتے ہوں کہ جس سے وہ ہمارے دلوں میں اور روح سے متعلق کے لئے دعا مانگنی چاہئے۔ اور نہ صرف افرادی کے لئے۔ بلکہ جماعتوں فرقوں ... اور مختلف حالتوں میں پڑے ہوئے آدمیوں کے

جو جیسا ...

ویسا ہی اُس کے لئے کم یا زیادہ دعا مانگنی ہم پر فرض ہے۔ ایک ایک گھر کے ہر آدمی کو اُسی گھر کے
باقی سب لوگوں کے لئے تو ہر روز دعا مانگنی نہایت فرض ہے۔ اور اُن کے بعد جیسا علاقہ خواہ
رشتہ کا خواہ دوستی کا خواہ پڑوس کا خواہ پیشگی کا خواہ کسی طرح کا علاقہ ہو۔ کم ہوتا جائے۔
ویسا ہی کم یعنی ہفتہ میں دو بار یا ایک بار یا دو ہفتوں میں ایک بار یا مہینے میں ایک بار وغیرہ اُن
کے لئے دعا مانگنی چاہئے۔ اسطرح ہر مسیحی کو یہہ بہت مفید ہوگا کہ دُنیا کے لوگوں کو چار یا پانچ
فہرستوں میں تقسیم کرکے ہر فہرست کے لوگوں کے لئے کم یا زیادہ دعا مانگنے کا قصد کرے۔ اور
جب قصد کر چکے تو صرف عین ضرورت ہی کے سبب سے اُس کے موافق دعا کو چھوڑے۔
۲۔ کتاب مقدس کا مطالعہ اس کی ضرورت صرف دعا مانگنے ہی کی ضرورت
سے کم ہے۔ دعا تو روح کا دم ہے۔ اور کتاب مقدس کا مطالعہ اُس کی غذا ہے۔ اس کے بغیر
روحانی زندگی [illegible] نہیں ٹھہر سکتی اور اُس کے بغیر بہت عرصہ تک نہیں ٹھہر سکتی اور زور
کچھ نہیں آسکتا۔ اس فرض کے ادا کرنے میں یہہ پانچ قواعد یاد رکھنا مفید ہوگا:—

(۱) ہر روز دو حصے پڑھا کرو ایک تو عہدنامہ عتیق میں سے اور دوسرا عہدنامہ جدید میں
سے اپنے تجربہ سے دریافت کرو کہ حصہ کتنا لمبا ہو۔ یہہ تو ہر آدمی کی فرصت اور حالت پر
منحصر ہے۔ لیکن حتی المقدور جہاں ٹھہرنے کے لائق جگہہ نہو وہاں مت ٹھہرو۔

عہدنامہ عتیق تو عہدنامہ جدید سے کوئی تین گنا لمبا ہے اور اس سبب سے جب تک
اُس کو ایک بار پڑھتے رہوگے اُس عرصہ میں تم اس کو کوئی تین بار پڑھ چکوگے
۔ کیونکہ عہدنامہ جدید بہت زیادہ واقف ...

توکم سے کم ہر کتاب کو لگاتار پڑھنا چاہیے۔ بعض مسیحی لوگ کبھی کہیں سے اور کبھی کہیں سے
حصے چن چن کر پڑھتے ہیں۔ لیکن یہہ بڑی بیوقوفی ہے۔ ڈکشنری کے سوا کوئی کتاب نہیں ہے جس
کا جو ایسا استعمال کرے وہ اُس کے مضامین سے کچھ واقفیت پیدا کر سکے +

(۳) پہلے پہل سوچا کرو۔ کہ مصنف کے دل میں لکھتے وقت کیا معنے ہونگے۔ اگر ہم پہلے اِس
سے واقف نہوں تو خدا کے کلام سے فائدہ نہیں بلکہ ضرر اُٹھانے کا امکان ہے +

(۴) اِس کے بعد اُس اوّل معنے کو جو تم متن سے نکال چکے ہو اور حتہ
صادق لاؤ یعنی یہہ سوچو کہ جن کے لئے یہہ کلام پہلے کہا یا لکھا
اور پھر میز کیا حال ہے؟ اُن کا حال اِس کلام کے اول مطلب سے جیسا علاقہ رکھتا
اُس کے کس معنے سے علاقہ رکھتا ہے؟ اُسکی مثالیں ہم پہلے دوسرے اور پانچ
میں دے چکے ہیں دیکھو ۲ تمتاس ۳: ۱۴ تا ۱۷ کو جہاں مقدس رسول عہد نامۂ عتیق
کی نصیحتوں اور مختلف تعلیموں کے لئے مفید کہتا ہے۔ لیکن یہہ اِس حال میں ہو سکتا ہے جب خادم
دین بنی اسرائیل کی حالت اور اپنے مسیحی گلّے کی حالت ملا کر عہد نامۂ عتیق کے معنوں کو پڑھکر
اس گلّے پر اسی کی حالت کے بموجب صادق لاتا ہے +

(۵) پڑھتے وقت اُس نہانی روشنی کے لئے دعا مانگو جس کے بغیر خدا کے کلام کا
مطالعہ ہمیشہ بیفائدہ رہیگا۔ دیکھو لوقا ۲۴: ۲۵ کو + کہو کہ "اے خداوند تو اِس کلام کے وسیلہ مجھے
... چاہتا ہے کہ میں اِس کلام کے مطابق اپنی زندگی گذرانوں ۔ میں اِس کلام کو
... وغیرہ"

نہیں کرسکتا۔ گو وہ دعا مانگے اور خدا کا کلام روز پڑھے۔ تو بھی اور مسیحی بھائیوں اور بہنوں
کی مدد سے اُس کو بہت فائدہ ہوگا۔ یہ خصوصاً تین قسم کی ہے۔

(۱) عام زندگی میں وقتاً فوقتاً کرتے رہنا۔

(۲) اچھی اچھی روحانی کتابیں پڑھنی۔

(۳) دیندار مسیحیوں کی صحبت اور اُن سے گفتگو کرنا۔ دیکھو ملاکی ۳: ۱۶ کو۔

۲ اوقات پر خصوصاً عشائے ربانی میں شریک ہونے سے پیشتر اپنے تئیں

۲ حال کیسا ہے میں آگے بڑھتا جاتا ہوں یا پیچھے ہٹتا جاتا ہوں

عشائے ربانی میں شریک ہونا